شذرات

ہماری دعوت	جاوید احمد غامدی	۲

قرآنیات

الاعراف (۸)	جاوید احمد غامدی	۵

معارف نبوی

دین حق	محمد رفیع مفتی	۲۳

سیر و سوانح

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (۲)	محمد وسیم اختر مفتی	۲۹

نقطۂ نظر

عہد رسالت میں خواتین کا سیاسی کردار (۳)	پروفیسر خورشید عالم	۳۹

جاوید احمد غامدی

ہماری دعوت

دین اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اُس نے پہلے انسان کی فطرت میں الہام فرمائی اور اِس کے بعد اُس کی تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسان کو دی ہے۔ اِس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ دین کا تنہا ماخذ اب آپ ہی کی ذات والا صفات ہے اور دین حق اب وہی ہے جسے آپ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے دین قرار دیں[1]۔

دنیا کے تمام انسانوں کو ہم اِس دین پر ایمان اور اِس کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تزکیے کی دعوت دیتے ہیں۔ جو لوگ اِس دعوت کو قبول کرلیں، اُن کا صلہ خدا کی جنت ہے جس کی وسعت پوری کائنات کی وسعت ہے؛ جس میں زندگی کے ساتھ موت، لذت کے ساتھ الم، خوشی کے ساتھ غم، اطمینان کے ساتھ اضطراب، راحت کے ساتھ تکلیف اور نعمت کے ساتھ نقمت کا کوئی تصور نہیں ہے؛ جس کا آرام دائمی ہے، جس کی لذت بے انتہا ہے، جس کے شب و روز جاوداں ہیں، جس کی سلامتی ابدی ہے، جس کی مسرت غیر فانی ہے، جس کا جمال لازوال اور کمال بے نہایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے اِس میں وہ کچھ مہیا کیا ہے جسے نہ آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اُس کا خیال کبھی گزرا ہے[2]۔

اِس وقت جو لوگ اِس دین کے ماننے والے ہیں، اُنھیں ہم دعوت دیتے ہیں کہ خدا کی اِس جنت کو پانے کے

---

[1] الجمعہ ۶۲:۲۔

[2] الاعلیٰ ۸۷:۱۴-۱۷۔

لیے اپنے عمل کو بھی وہ اپنے ایمان کے مطابق کر لیں، خدا اور اُس کے بندوں کے حقوق پوری دیانت اور پورے اخلاص کے ساتھ ادا کریں اور کسی کے جان و مال اور آبرو کے خلاف کوئی زیادتی نہ کریں[3]۔

ہم اُنھیں دعوت دیتے ہیں کہ اپنے ماحول اور اپنے دائرۂ عمل میں وہ ایک دوسرے کو بھلائی کی نصیحت کریں اور برائی سے روکیں۔ یہ اُن کا فرض ہے جو اُن کے پروردگار نے اُن پر عائد کیا ہے۔ یہ فرض باپ کو بیٹے کے لیے اور بیٹے کو باپ کے لیے، شوہر کو بیوی کے لیے اور بیوی کو شوہر کے لیے، بھائی کو بہن کے لیے اور بہن کو بھائی کے لیے، دوست کو دوست کے لیے اور پڑوسی کو پڑوسی کے لیے، غرض یہ کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ متعلق ہر شخص کے لیے ادا کرنا ہے۔ چنانچہ وہ جہاں یہ دیکھیں کہ اُن کے متعلقین میں سے کسی نے کوئی خلاف حق طریقہ اختیار کیا ہے، اُنھیں چاہیے کہ اپنے علم اور اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق اُسے راستی کی روش اپنانے کی نصیحت کریں[4]۔

دین و دنیا کے کسی معاملے میں اُن کے جذبات، تعصّبات، مفادات اور خواہشیں اگر اُنھیں انصاف کی راہ سے ہٹانا چاہیں تو حق و انصاف پر قائم رہیں، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ کریں تو جان کی بازی لگا کر اِن کا یہ مطالبہ پورا کریں۔ حق کہیں، حق کے سامنے اپنا سر جھکا دیں، انصاف کی گواہی دیں اور اپنے عقیدہ و عمل میں انصاف کے سوا کبھی کوئی چیز اختیار نہ کریں[5]۔

اُنھیں مذہبی جبر (persecution) کا نشانہ بنایا جائے تو تشدد کے جواب میں تشدد کا طریقہ اختیار کرنے کے بجاے صبر کریں[6] اور ممکن ہو تو جس جگہ یہ صورت حال پیش آ جائے، اُس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائیں، جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکیں[7]۔

مدرسۂ فراہی کے اکابر اہل علم نے خدا کی توفیق سے دین حق کو دور حاضر میں فقہ و کلام اور فلسفہ و تصوف کی ہر آمیزش سے الگ کر کے بے کم و کاست اور خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر پیش کر دیا ہے۔ اِس دین کی نشر و اشاعت، اِس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اِس کی روشنی میں مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تشکیل جدید ایک جہاد کبیر ہے۔

۳؎ النحل ۱۶: ۹۰۔

۴؎ التوبہ ۹: ۷۱۔

۵؎ النساء ۴: ۱۳۵۔ المائدہ ۵: ۸۔

۶؎ حٰم السجدہ ۴۱: ۳۳-۳۵۔

۷؎ النساء ۴: ۹۷۔

ہم اُنھیں دعوت دیتے ہیں کہ اپنی تائید، اپنے وقت اور اپنے وسائل سے وہ اِس جہاد میں ہماری مدد کریں۔ یہ خدا کے سچے دین کی نصرت ہے جس سے زیادہ کوئی چیز بھی بندۂ مومن کو عزیز نہیں ہونی چاہیے۔[8]

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ، کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ؟ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ. (الصف ۶۱:۱۴)

''ایمان والو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا تھا: کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں۔''

۸؎ التوبہ ۹:۲۴۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الاعراف

(۸)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ

اِن (قوموں) کے بعد (جن کا ذکر اوپر ہوا ہے) ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ[۴۵۴] فرعون[۴۵۵] اور اُس کے سرداروں کے پاس (رسول بنا کر) بھیجا، مگر اُنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اِن (نشانیوں) کا انکار کر دیا۔[۴۵۶] پھر دیکھو کہ اِن مفسدوں کا انجام کیا ہوا![۴۵۷] موسیٰ نے کہا: اے فرعون، میں جہانوں کے پروردگار

۴۵۴؎ اصل میں لفظ 'اٰیٰت' آیا ہے۔ اِس سے مراد وہ عقلی اور فطری دلائل بھی ہیں جو حضرت موسیٰ اور ہارون نے فرعون اور اُس کے سرداروں کے سامنے پیش کیے اور وہ حسی معجزات بھی جو اُنھوں نے فرعون اور اُس کی قوم کو دکھائے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں اُن کی تفصیل کی گئی ہے۔

۴۵۵؎ لفظ فرعون 'رع' کی طرف منسوب ہے۔ قدیم اہل مصر سورج کو اپنا رب اعلیٰ یا مہا دیو قرار دیتے اور اُسے 'رع' کہتے تھے۔ چنانچہ لفظ فرعون کے معنی ہیں: سورج دیوتا کی اولاد۔ مصر کے بادشاہ اُس زمانے میں اپنے آپ کو 'رع' کے جسمانی مظہر اور اُس کے ارضی نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے اور لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ اُن کے رب اعلیٰ یا مہا دیو وہی ہیں۔ دور حاضر کے محققین کا عام میلان ہے کہ یہ فرعون منفتہ یا منفتاح تھا۔

رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيۡقٌ عَلٰۤى اَنۡ لَّاۤ اَقُوۡلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ ؕ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ
بِبَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَرۡسِلۡ مَعِىَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ

کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ مجھے یہی چاہیے اور میں اِسی کا حریص ہوں[۴۵۸] کہ خدا کی طرف سے حق کے سوا کوئی بات نہ کہوں۔ تمھارے پروردگار کی طرف سے میں تمھارے پاس (اپنے اِس منصب کی) صریح نشانی[۴۵۹] لے کر آیا ہوں، سو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو[۴۶۰]۔ اُس نے جواب دیا: اگر کوئی نشانی

۴۵۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَظَلَمُوۡا بِهَا'۔ اِن میں 'ب' کا صلہ دلیل ہے کہ 'ظلموا' یہاں 'کفروا' یا 'جحدوا' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۴۵۷؎ سورہ کے مخاطبین کو یہ اِس سرگذشت کے سنانے کی اصل غایت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ خدا اور اُس کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی جائے تو قرآن اِسے بھی فساد سے تعبیر کرتا ہے۔ فرعون اور اُس کے سرداروں کے لیے 'مُفۡسِدِيۡنَ' کا لفظ یہاں اِسی مفہوم میں ہے۔

۴۵۸؎ اصل میں 'حَقِيۡقٌ عَلٰۤى اَنۡ لَّاۤ اَقُوۡلَ' کے الفاظ ہیں۔ اہل اور سزاوار کے معنی 'حقیق به' یا 'هو حقیق ان یفعل کذا' کے الفاظ آتے ہیں۔ یہاں اِس کے ساتھ 'عَلٰى' ہے۔ اِس سے یہ حریص کے معنی پر متضمن ہو گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...ظاہر ہے کہ جو خدا کا رسول اور سفیر ہو، وہی سب سے زیادہ اہل اِس بات کا ہو سکتا ہے کہ خدا کی صحیح صحیح ترجمانی کرے، اُس پر کوئی من گھڑت بات نہ لگائے، اِس لیے کہ اُس کا علم ظن و قیاس پر نہیں، بلکہ براہ راست خدا کی وحی اور خطاب پر مبنی ہوتا ہے اور اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے وہ اِس بات کا نہایت حریص بھی ہوتا ہے کہ اُس کی زبان سے کوئی کلمہ حق کے خلاف نہ نکلے، اِس لیے کہ جس پرسش کا خوف اُسے ہوتا یا ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہ ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۴۰)

۴۵۹؎ اِس سے مراد عصا اور ید بیضا کا وہ معجزہ ہے جس کا ذکر آگے ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے باجبروت بادشاہ کے پاس بھیجنے کے لیے ضروری تھا کہ اُنھیں ایسے غیر معمولی معجزات دیے جائیں اور وہ شروع ہی میں اُن کا مظاہرہ بھی کر دیں تاکہ فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر اُن کی بات سننے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

۴۶۰؎ دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے صرف یہ مطالبہ ہی نہیں کیا، اِس کے ساتھ انبیا

فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٠٦﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٧﴾
وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ
هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٩﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿١١٠﴾
قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿١١١﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ

لے کر آئے ہو تو اُسے پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ اِس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دی تو یکا یک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا[۴۶۱] اور اُس نے اپنا ہاتھ (آستین سے) کھینچا تو دیکھنے والوں کے لیے وہ دفعتاً چمکتا ہوا نکلا۔[۴۶۲] فرعون کے سرداروں نے (یہ دیکھا تو) کہا: یہ شخص تو بڑا ماہر جادوگر ہے، تمھیں تمھارے ملک سے نکال دینا چاہتا ہے،[۴۶۳] سو بتاؤ، کیا راے دیتے ہو؟ پھر سب نے (فرعون) کو مشورہ دیا کہ ابھی اِس

علیہم السلام کے عام طریقے کے مطابق فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر کو توحید اور معاد پر ایمان اور خشیت و تذکر کی دعوت دی اور اپنے غیر معمولی معجزات سے اُن پر اتمام حجت بھی کر دیا جس کے نتیجے میں وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا یہ مطالبہ بھی، معاذ اللہ کسی قوم پرست لیڈر کی طرف سے اپنی قوم کو غلامی سے چھڑانے کا مطالبہ نہیں تھا، بلکہ خدا کی اُس اسکیم کو بروے کار لانے کے لیے کیا گیا تھا جس کے تحت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو عالمی سطح پر ابلاغ دعوت اور اتمام حجت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اِس اسکیم کے مطابق یہ ضروری تھا کہ اُنھیں ایک خاص علاقے میں آباد کر کے وہاں دعوت حق کا مرکز قائم کیا جائے۔ بائیبل کی کتاب خروج کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ پوری اسکیم فرعون اور اُس کے درباریوں کے سامنے واضح نہیں فرمائی، بلکہ صرف اتنا کہا کہ وہ قربانی کی عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانا چاہتے ہیں، اِس لیے کہ جس چیز کی قربانی کرنا پیش نظر ہے، اُس کی قربانی اگر مصر میں کی گئی تو وہاں کے لوگ اُنھیں سنگ سار کر دیں گے۔

۴۶۱؎ یعنی ایسا کھلا اژدہا کہ جس میں ذرا کسی شبہے کی گنجایش نہ ہو۔ آیت میں 'ثُعْبَان' کے ساتھ 'مُبِيْن' کی صفت اِسی مفہوم کے لیے لائی گئی ہے۔

۴۶۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ'۔ 'نظر' کا لفظ عربی زبان میں اصلاً غور و تامل کے ساتھ دیکھنے کے لیے آتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوئی، وہ محض فریب نظر کی نوعیت کی نہیں تھی، بلکہ غور و تامل سے

عَلِيمٍ ﴿١١٢﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٣﴾
قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿١١٤﴾
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿١١٥﴾ قَالَ اَلْقُوْا

کو اور اِس کے بھائی کو ٹال دیجیے [۴۶۴] اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیجیے جو سب ماہر جادوگروں کو اکٹھا کرکے آپ کے پاس لے آئیں۔ (چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) اور جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔ اُنھوں نے کہا: اگر ہم جیت گئے تو بڑا صلہ تو ہمیں یقیناً ملے گا [۴۶۵]؟ فرعون نے جواب دیا: ہاں، ضرور اور تم ہمارے مقربین میں شامل ہو گے۔ ۱۰۳-۱۱۴

(اِس پر) جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ، تم پھینکو گے یا (اگر تم چاہو تو) ہم پھینکتے ہیں [۴۶۶]؟ اُس نے کہا:

دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا تھا کہ اُس کی تابانی بالکل اصلی اور حقیقی ہے۔

۴۶۳؎ یعنی کچھ ایسا ویسا جادوگر نہیں ہے، بلکہ بڑا ماہر جادوگر ہے اور بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ اِس لیے کر رہا ہے کہ اُنھیں منظّم کرکے اپنی فوج بنائے اور تم پر حملہ کرکے تمھیں اِس ملک سے نکال دے اور یہاں اپنی حکومت قائم کرلے۔ موسیٰ علیہ السلام کی غیر معمولی شخصیت اور بنی اسرائیل کی کثیر تعداد کے پیش نظر یہ بات بالکل قرین قیاس تھی۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ فرعون کے درباریوں نے فی الواقع یہی سمجھا ہو اور اِس کا بھی امکان ہے کہ اُنھوں نے اپنے لوگوں کو آں جناب کی دعوت سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ اشغلا اُسی طریقے پر چھوڑا ہو، جس طرح کہ ہر دور کے ارباب اقتدار کا شیوہ رہا ہے۔

۴۶۴؎ اصل میں 'اَرْجِهْ وَاَخَاهُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَرْجِهْ' درحقیقت 'ارجئه' ہے۔ لفظ کو ہلکا کرنے کے لیے اِس طرح کے تصرفات عربی زبان میں عام ہو جاتے ہیں۔

۴۶۵؎ قرآن نے یہ جملہ ساحروں کی اخلاقی پستی اور دناءت کو واضح کرنے کے لیے نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیشہ وروں کے عام طریقے کے مطابق اُنھوں نے اِس خوش آمدانہ انداز میں انعام کی توقع کا اظہار کیا۔

۴۶۶؎ یہ بات اُنھوں نے پیشہ ورانہ اخلاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی، لیکن جملے کا اسلوب ایسا ہے کہ اُن کی یہ خواہش بھی اُس سے ظاہر ہو رہی ہے کہ حضرت موسیٰ چاہیں تو وہ پہل کرنے کے لیے تیار ہیں۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۱۶﴾
وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ
الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا ھُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِیْنَ ﴿۱۱۹﴾
وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰی وَ

تم ہی پھینکو۔[۴۶۷] چنانچہ اُنھوں نے پھینکا تو لوگوں کی آنکھیں باندھ دیں[۴۶۸] اور اُن پر دہشت طاری کر دی اور بڑا زبردست جادو بنا لائے۔ ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ اپنا عصا پھینکو۔ اُس کا پھینکنا تھا کہ وہ اُن کے اُس طلسم کو نگلتا چلا گیا جو وہ بنا لائے تھے۔ سو حق ظاہر ہوا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے، سب باطل ہو گیا۔[۴۶۹] فرعون اور اُس کے ساتھی (اُس روز) وہاں مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے اور جادوگر (خدا کی اِس نشانی کو دیکھ کر) سجدے میں گر پڑے۔[۴۷۰] اُنھوں نے (بے اختیار) کہا: ہم جہانوں کے پروردگار

۴۶۷؎ موسیٰ علیہ السلام کو پورا اعتماد تھا کہ اُن کا پروردگار اُن کے ساتھ ہے، اِس لیے اُنھوں نے پہلے اُنھی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں۔ جادوگر جب اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو جوے کے تیروں کی طرح کوئی چیز دیکھنے والوں کے سامنے پھینکتے اور اُس پر اپنا جادو دکھاتے ہیں۔ آیت میں 'اِلْقَاء' یعنی پھینکنے کا لفظ اِسی مناسبت سے آیا ہے۔

۴۶۸؎ یہ قرآن نے جادو کی حقیقت واضح کر دی ہے کہ اُس سے کسی چیز کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی۔ وہ محض نگاہ اور قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے جس سے انسان وہی کچھ دیکھنے لگتا ہے جو جادوگر دکھانا چاہتا ہے۔

۴۶۹؎ یعنی عصا کا سانپ جدھر جدھر گیا، اُس نے سانپوں کی طرح لہراتی ہوئی ہر رسی اور لاٹھی کو اُسی طرح رسی اور لاٹھی بنا دیا جس طرح وہ حقیقت میں تھی اور سارا طلسم نابود ہو گیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ مہ نخشب کے مقابلے میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔ ظاہر ہے کہ ہزاروں مصنوعی چاند، سورج ہوں، جب بھی حقیقی سورج کے نکلتے ہی اُن کی چمک دمک ملمع کی طرح غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ کے معجزے کے ظاہر ہوتے ہی ساحروں کا سارا طلسم غائب ہو گیا۔"

(تدبر قرآن ۳/۳۴۷)

۴۷۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ'۔ 'اُلْقِیَ' مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ جادوگروں کے

هٰرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

قَالَ فِرۡعَوۡنُ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ اِنَّ هٰذَا لَمَکۡرٌ مَّکَرۡتُمُوۡهُ فِی الۡمَدِیۡنَةِ
لِتُخۡرِجُوۡا مِنۡهَاۤ اَهۡلَهَا فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَاَرۡجُلَکُمۡ
مِّنۡ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

پر ایمان لے آئے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے[۱۷۱]۔۱۱۵-۱۲۲

فرعون نے کہا: تم میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے ہو؟ یہ ایک سازش ہے جو تم نے اِس شہر میں اِس لیے کی ہے کہ اِس کے باشندوں کو وہاں سے نکال دو[۱۷۲]۔ سو (اِس کا نتیجہ) تمھیں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا، پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ اُنھوں نے

جذبۂ تعظیم و اکرام کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ سحر و ساحری اور اِس طرح کے دوسرے علوم و فنون کو اُن کے ماہرین ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اِن میں اور معجزے میں فرق کے لیے یہ نہایت واضح معیار ہے کہ اِن علوم و فنون کے ماہرین بھی اُس کے سامنے اعتراف عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

۱۷۱؎ یہ صاف فرعون کی خدائی سے انکار تھا۔ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۷۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقابلے پر آنے سے پہلے ہی جادوگر کسی حد تک سمجھ چکے تھے کہ معاملہ اُن کے کسی ہم پیشہ سے نہیں ہے۔ آیت میں 'مَآ اَکۡرَهۡتَنَا عَلَیۡهِ مِنَ السِّحۡرِ' کے الفاظ اِسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے اندر دبی ہوئی روشنی اِسی کی منتظر تھی کہ کوئی آگ دکھائے اور وہ بھڑک اٹھے۔ استاذ امام کے الفاظ میں سعادت کا کوئی شمہ بھی انسان کے اندر موجود ہو تو بتوفیق الٰہی وہ اپنا اثر دکھا ہی جاتا ہے۔

۱۷۲؎ جادوگروں کے اعتراف حق سے مجمع پر جو اثر پڑا اور فرعون اور اُس کے درباری جس طرح رسوا ہو کر رہ گئے، اُس کی خفت مٹانے اور بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے کے لیے اُس نے کائیاں سیاسیوں کی طرح فوراً اُن پر سازش کا الزام رکھ کر سزا سنا دی کہ یہ سب تمھاری اور موسیٰ کی ملی بھگت ہے۔ تم سب مل کر ہمارے خلاف بغاوت کرنا چاہتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے میری اجازت کا انتظار بھی نہیں کیا اور موسیٰ پر ایمان کا اعلان کر دیا ہے۔ اب میں تمھیں وہی سزا دوں گا جو سلطنت کے باغیوں کو دی جاتی ہے۔

وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲۶﴾

وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اَتَذَرُ مُوۡسٰی وَقَوۡمَهٗ لِیُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ ۚ وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

جواب دیا: (پھر کیا ہے)، ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹیں گے! تم صرف اِس غصے میں ہمارے درپے آزار ہو رہے ہو کہ ہمارے پروردگار کی نشانیاں جب ہمارے پاس آگئیں تو ہم اُن پر ایمان لے آئے۔ پروردگار، (اب) تو ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہمیں اِس حال میں دنیا سے اٹھا کہ ہم مسلمان ہوں[۳۴۷]۔ ۱۲۳-۱۲۶

فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تم موسیٰ اور اُس کی قوم کو اِسی طرح چھوڑے رکھو گے کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور تمھیں اور تمھارے (ٹھیرائے ہوئے) معبودوں کو ٹھکرائیں[۳۴۸]؟ فرعون نے جواب دیا: ہم اُن کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دیں گے۔ ہم اُن پر

۳۴۷؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سچا ایمان آن کی آن میں انسان کو کس بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ وہی جادوگر ہیں جن کی دناءت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور مسخروں کی طرح اپنے فن کے مظاہرے پر بھرپور انعام کی التجا پیش کرتے ہیں یا اب یہ حال ہے کہ ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی اُن کے باطن کا ہر گوشہ اِس طرح جگمگا اٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، تاریکی کی کوئی پرچھائیں اُن کے دلوں پر کبھی پڑی ہی نہیں تھی اور یہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ یہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ اور پاکیزگی و قدوسیت کے ملائک صفت پیکر ہیں۔ غور کیجیے، فرعون نے کتنی بڑی دھمکی اُن کو دی، لیکن اُنھوں نے اِس کے جواب میں فرمایا تو یہ فرمایا کہ کچھ غم نہیں، اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دے دی تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے، اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور جب تیرا سارا غضب ہمارے اوپر اِس جرم میں ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر، جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے تو

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْٓا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ

پوری طرح حاوی ہیں[۷۵]۔ (اِس پر) موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کی: تم اللہ سے مدد چاہو[۷۶] اور ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اُس کا وارث بنا دیتا ہے اور (یاد رکھو کہ) آخر میں کامیابی اُنھی کی ہے جو (اُس سے) ڈرنے والے ہوں[۷۷]۔ اُنھوں نے کہا: ہم تمھارے

جو کچھ تو کر سکتا ہے، وہ کر گزر، اگر اِس جرم کی یہ سزا ہے تو ہم اِس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔'' (تدبرقرآن ۳/۳۴۸)

۷۴۔ اِس سے مراد خود فرعون کے بت ہیں جو سورج دیوتا کے اوتار کی حیثیت سے خود اُس کے حکم سے پورے ملک میں پوجے جا رہے تھے۔ عربی زبان میں اضافت اِس طرح کے مفہوم کے لیے بھی آ جاتی ہے۔

۷۵۔ بنی اسرائیل کی نسل کشی کے لیے یہی اسکیم حضرت موسیٰ کی پیدایش سے پہلے رعمیسس دوم کے زمانے میں بھی جاری رہی تھی۔ اپنے ہی منتخب کیے ہوئے میدان میں شکست کھا کر جب درباریوں نے موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کے خلاف سخت اقدام کا مطالبہ کیا تو فرعون نے ظلم و ستم کی وہی اسکیم دوبارہ جاری کرنے کا اعلان کر دیا۔ نیز یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ اس کے نتیجے میں کسی بغاوت کا اندیشہ نہیں ہے، ہمارا اقتدار اُن کے اوپر پوری طرح مستحکم ہے۔

۷۶۔ یعنی نماز میں اُس کے سامنے سربسجود ہو کر اُس سے مدد کی درخواست کرو۔ اللہ سے مدد چاہنے کا یہی طریقہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...فتنوں اور آزمایشوں میں استقامت بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اِسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے کہ 'وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ'* (اور تمھیں صبر نہیں حاصل ہو سکتا، مگر اللہ ہی کی مدد سے)۔ اللہ کی یہ مدد حاصل کرنے کا واسطہ نماز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اِس نماز سے مراد صرف عام نماز نہیں ہے، بلکہ وہ خاص نماز بھی ہے جس کی تاکید آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مکی زندگی کے ابتدائی پرمحن دور میں کی گئی تھی۔ اِسی چیز کی تاکید حضرت موسیٰ اور ہارون کو بھی کی گئی۔'' (تدبرقرآن ۳/۳۵۱)

۷۷۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، لہٰذا یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اُس کے ساتھیوں کو اُن کے دشمنوں پر لازماً غلبہ عطا فرماتے ہیں۔

* النحل ۱۶: ۱۲۷۔

مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾
فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰی
وَمَنْ مَّعَهٗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوْا
مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرْسَلْنَا

آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمھارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں[۴۷۸]۔ موسیٰ نے جواب دیا: امید ہے کہ تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمھیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو[۴۷۹]۔ ۱۲۷-۱۲۹

ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط میں اور پیداوار کی کمی (کے عذاب) میں مبتلا رکھا تاکہ وہ متنبہ ہوں[۴۸۰]، لیکن (ہوا یہ کہ) جب اُن کے اچھے دن آتے تو کہتے کہ ہم اِسی کے مستحق ہیں اور جب برے دن آتے تو اُس کو موسیٰ اور اُس کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے تھے۔ سنو، اِن لوگوں کی نحوست تو اللہ ہی کے پاس ہے، مگر اِن میں سے اکثر نہیں جانتے[۴۸۱]۔ اُنھوں نے یہی کہا کہ ہمیں مسحور کر دینے کے لیے تم

۴۷۸؎ بنی اسرائیل کا یہ جواب اُن کی روایتی بے یقینی اور ضعیف الاعتقادی کا اظہار ہے۔

۴۷۹؎ یہ برسر موقع تنبیہ ہے کہ خدا کے پیغمبر کا ساتھ دو گے تو بادشاہی ضرور مل جائے گی، مگر برقرار اُسی صورت میں رہے گی، جب اُس کا حق ادا کیا جائے گا۔ پچھلے رسولوں کی امتوں کی طرح بدمست ہو کر زمین میں فساد برپا کرو گے تو اُنھی کی طرح یہ تم سے بھی چھین لی جائے گی۔

۴۸۰؎ رسولوں کے باب میں یہ سنت الٰہی پیچھے بیان ہوئی ہے کہ اُن کی دعوت جب انذار عام کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو اِس طرح کی آزمایشیں لوگوں کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے لیے آسمان سے نازل کی جاتی ہیں۔

۴۸۱؎ مطلب یہ ہے کہ اپنی نحوست دوسروں کے طالع میں ڈھونڈتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ خدا کا فیصلہ ہے جو

عَلَيۡهِمُ الطُّوۡفَانَ وَالۡجَرَادَ وَالۡقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا
وَكَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيۡهِمُ الرِّجۡزُ قَالُوۡا يٰمُوۡسَى ادۡعُ

خواہ کوئی نشانی لے آؤ، ہم تمھاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ سو ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، ٹڈیاں، جوئیں اور مینڈک چھوڑ دیے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں تھیں، (بنی اسرائیل کے صحیفوں میں) جن کی تفصیل کر دی گئی ہے۔[۴۸۲] مگر وہ تکبر کرتے رہے اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ مجرم لوگ تھے۔ جب

اُن کی بداعمالیوں کے نتیجے میں اُن کے خلاف صادر ہو گیا ہے۔

۴۸۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ'۔ یہ حال واقع ہوئے ہیں اور قرینہ دلیل ہے کہ 'مُفَصَّلٰت' کا ظرف یہاں محذوف ہے، یعنی اُن کی تفصیل بنی اسرائیل کے صحیفوں میں کر دی گئی ہے۔ چنانچہ بائیبل کی کتاب خروج میں طوفان کی تفصیل اِس طرح آئی ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ سب ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے، اولے گریں۔ اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور (بجلیوں کی) آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملک مصر پر اولے برسائے۔ پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی، ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملک مصر میں اُن کو جو میدان میں تھے، کیا انسان کیا حیوان، سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے اور میدان کے سب درختوں کو توڑ ڈالا۔'' (۹:۲۲-۲۵)

ٹڈی دل کے حملے کی تفصیل اِس طرح بیان ہوئی ہے:

''تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی سبزی کو جو اِس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے، چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اُس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور اُن کا دَل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو اُن سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ اُن کے بعد پھر آئیں گی۔ کیونکہ اُنھوں نے تمام روے زمین کو ڈھانک لیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور اُنھوں نے اُس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے، چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی، نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی۔'' (۱۰:۱۲-۱۵)

لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ

کوئی آفت اُن پر ٹوٹ پڑتی[۴۸۳] تو کہتے: اے موسیٰ، اپنے پروردگار سے تم اُس عہد کی بنا پر جو اُس نے تم سے کر رکھا ہے،[۴۸۴] ہمارے لیے دعا کرو۔ اگر یہ آفت تو نے (اِس وقت) ہم سے ہٹا دی تو ہم تمھاری

جوؤں کا حملہ جس طرح ہوا، اُس کی تفصیل یہ ہے:

''تب خداوند نے موسیٰ سے کہا: ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مارتا کہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہو گئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔'' (۸: ۱۶-۱۷)

مینڈکوں کے عذاب کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے:

''پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اُس سے کہہ، خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔ اور اگر تو اُن کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آکر تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے۔ اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھالا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا، اُس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔'' (۸: ۱-۶)

خون کا عذاب جس صورت میں ظاہر ہوا، اُس کی تفصیل یہ ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے، یعنی دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ وہ خون بن جائیں اور سارے ملک مصر میں پتھر اور لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہی خون ہوگا۔ اور موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا۔ اُس نے لاٹھی اٹھا کر اُسے فرعون اور اُس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا پانی سب خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی پی نہ سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہو گیا۔'' (۷: ۱۹-۲۱)

۴۸۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ'۔ اِن میں 'لَمَّا'، 'كُلَّمَا' کے معنی میں ہے۔ تصویر حال مقصود

بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الرِّجۡزَ اِلٰۤی اَجَلٍ هُمۡ بٰلِغُوۡهُ اِذَا هُمۡ
یَنۡكُثُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِی الۡیَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوۡا
عَنۡهَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِیۡنَ كَانُوۡا یُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ
وَمَغَارِبَهَا الَّتِیۡ بٰرَكۡنَا فِیۡهَا وَ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ الۡحُسۡنٰی عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ

بات ضرور مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ جانے دیں گے۔ پھر جب کچھ مدت کے لیے، جس تک اُنھیں پہنچنا ہی تھا،[۴۸۵] وہ آفت ہم اُن سے ہٹا دیتے تو اُسی وقت عہد کو توڑ دیتے تھے۔[۴۸۶] سو ہم نے اُن سے انتقام لیا[۴۸۷] اور اُنھیں سمندر میں غرق کر دیا، اِس لیے کہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروا بنے رہے اور اُن کو جو دبا کر رکھے گئے تھے، ہم نے اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں۔[۴۸۸] بنی اسرائیل پر تیرے پروردگار کا وعدۂ خیر اِس طرح

ہو تو یہ اِس معنی میں بھی آتا ہے۔ آگے آیت ۱۸۹ میں اِس کی نظیر موجود ہے۔

۴۸۴؎ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمھاری بات سننے اور اُس کی حرمت قائم رکھنے کا جو عہد کر رکھا ہے۔

۴۸۵؎ یعنی جو بہرحال ختم ہو جانا تھی اور اُن کے جھوٹ اور فریب کا پردہ جس کے بعد لازماً چاک ہو جانا تھا۔

۴۸۶؎ اِس کا ذکر بائیبل میں بھی ہوا ہے۔ کتاب خروج میں ہے:

''تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کرے اور میں اِن لوگوں کو جانے دوں گا تا کہ وہ خداوند کے لیے قربانی کریں۔'' (۸:۸)

''فرعون نے کہا: میں تم کو جانے دوں گا تا کہ تم خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو، لیکن تم دور مت جانا اور میرے لیے شفاعت کرنا... پر فرعون نے اِس بار بھی اپنا دل سخت کر لیا اور اُن لوگوں کو جانے نہ دیا۔''

(۸:۲۸-۳۲)

۴۸۷؎ یعنی اُن جرائم کا انتقام لیا جن پر وہ اتمام حجت کے باوجود جمے رہے۔

۴۸۸؎ اِس سے فلسطین کی سرزمین مراد ہے جسے بنی اسرائیل کے لیے توحید کے مرکز کی حیثیت سے منتخب کیا گیا اور جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت سے مادی اور روحانی، دونوں قسم کی برکتیں اُن کے لیے رکھ دی تھیں۔

بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

پورا ہوا[۴۸۹] کیونکہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اُس کی قوم کا سب کچھ برباد کر دیا جو وہ (اپنے شہروں میں) بناتے اور جو کچھ (دیہات کے باغوں اور کھیتوں میں ٹٹیوں پر) چڑھاتے تھے[۴۹۰]۔ ۱۳۰-۱۳۷

(دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر کے پار اتار دیا[۴۹۱]۔ پھر اُن کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو (اِس قدر احمق تھی کہ) اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی[۴۹۲]۔ بنی اسرائیل نے (یہ دیکھا تو) کہا: اے موسیٰ، جس طرح اِن کے معبود ہیں، اِسی طرح کا ایک معبود ہمارے لیے بھی بنا دو[۴۹۳]۔ موسیٰ نے کہا: تم

آیت میں 'مَشَارِق' اور 'مَغَارِب' کے الفاظ اِس سرزمین کی وسعت اطراف کو بیان کرنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ اِس بات کی واضح نظیر ہے کہ عربی زبان میں جمع اِس مفہوم کے لیے بھی آتی ہے۔

۴۸۹؎ اُس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو پیچھے آیات ۱۲۸-۱۲۹ میں مذکور ہے۔

۴۹۰؎ یعنی انگور جس کی پیداوار میں مصر کو اُس زمانے میں امتیاز حاصل تھا۔ یہ جزو غالب کے ذکر سے کسی چیز کی تعبیر کا اسلوب ہے، ورنہ مدعا یہی ہے کہ اُن کے تمام شہر اور باغ ملیامیٹ کر دیے گئے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اتمام حجت کے بعد صرف فرعون اور اُس کے لشکر ہی غرقاب نہیں ہوئے، بلکہ پورے ملک پر تباہی آئی جس سے محل اور ایوان بھی منہدم ہوئے اور ہر قسم کے باغات بھی اجڑ گئے۔

۴۹۱؎ فرعون کا انجام بیان کرنے کے بعد یہاں سے اب بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو خدائی دینونت کے عالمی ظہور کی سرگذشت ہے۔

۴۹۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'يَعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ'۔ یہ اسلوب بیان اپنے اندر تحقیر کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسی کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اِس جملے میں 'عکف' 'عَلٰی' کے ساتھ آیا ہے۔ اِس سے کسی چیز پر جمے ہونے اور اپنے آپ کو اُس سے وابستہ کر لینے کا مفہوم اِس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یہ غالباً موجودہ شہر طور اور ابوزینمہ کے قریب کسی مقام کا ذکر ہے جس سے بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف جاتے ہوئے گزرے۔ مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ اور قدیم زمانے سے سامی قوموں کی

اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْہِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰھًا وَّھُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَاِذْ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً وَّاَتْمَمْنٰھَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّہٖٓ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً

بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ یہ جس کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں، وہ سراسر باطل ہے۔ اُس نے کہا: کیا میں تمھارے لیے خدا کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں، دراں حالیکہ وہی ہے جس نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت بخشی ہے؟ یاد کرو، جب ہم نے فرعون کے لوگوں سے تمھیں نجات عطا فرمائی جو تمھیں سخت عذاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ وہ تمھارے بیٹوں کو بڑی بے دردی سے قتل کرتے اور تمھاری عورتیں جیتی رکھتے تھے اور اِس میں تمھارے پروردگار کی طرف سے (تمھارے لیے) بڑی عنایت تھی۔[۴۹۴] ۱۳۸-۱۴۱

(بنی اسرائیل وہاں سے آگے بڑھے تو) ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ ٹھیرایا اور دس مزید راتوں سے اُس کو پورا کیا تو (اِس کے نتیجے میں) اُس کے پروردگار کی ٹھیرائی ہوئی مدت، چالیس

چاند دیوی کا معبد اِسی علاقے میں تھا۔

۴۹۳؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اُن سے بھی زیادہ احمق ثابت ہوئے اور خدا کے جلال و جمال کی اتنی نشانیں دیکھ لینے کے بعد بھی اُس ذہنی پستی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہوئے جس میں مصر کی غلامی نے اُنھیں ڈال رکھا تھا۔ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام مصر کے دوران میں وہ اُن کے دیوتاؤں کی پرستش بھی کرنے لگے تھے۔ چنانچہ وہاں سے نکلنے کے فوراً بعد ہی جو بت کدہ سامنے آیا، اُس کو دیکھ کر اُن کی پیشانیاں اپنے پرانے معبودوں کے آستانے پر سجدے کے لیے بے تاب ہو گئیں۔

۴۹۴؎ اِس میں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا ذکر بیٹوں کے لفظ سے ہوا ہے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا ذکر کرتے ہوئے تمھاری عورتوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلی تعبیر، اگر غور کیجیے تو شفقت پدری

وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ
الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ
اَنْظُرْ اِلَیْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوْفَ
تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ

راتیں پوری ہوگئی۔[۴۹۵] (اِس وعدے کے لیے جاتے ہوئے) موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرو گے اور (لوگوں کی) اصلاح کرتے رہو گے اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہیں چلو گے۔[۴۹۶] جب موسیٰ ہمارے ٹھیرائے ہوئے وقت پر پہنچ گیا اور اُس کے پروردگار نے اُس سے کلام کیا تو اُس نے التجا کی کہ پروردگار، مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھوں۔[۴۹۷] فرمایا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ البتہ، اِس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو آگے تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ پھر جب اُس کے پروردگار نے پہاڑ (کے ایک حصے) پر تجلی کی تو اُس کو ریزہ

کا جذبہ ابھارتی ہے اور دوسری غیرت کو حرکت میں لانے کا باعث بنتی ہے۔ جملے کا اسلوب بھی قابل توجہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بات کے ساتھ ملا کر گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی بات اُن کی زبان پر جاری کر دی ہے۔

۴۹۵ یہ اُس وعدے کا ذکر ہے جو دریا پار کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی شریعت دینے کے لیے فرمایا۔ چالیس راتوں کی یہ مدت اُس ذہنی اور قلبی تیاری کے لیے تھی جو کتاب الٰہی کا حامل بننے کے لیے ضروری تھی۔ پہلے یہ وعدہ تیس دنوں کا تھا، لیکن سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۸۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام شوق ملاقات میں وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ چنانچہ اُن کی اِس جلد بازی کے باعث اللہ تعالیٰ نے اُن کی تربیت کے لیے یہ مدت تیس دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی۔

۴۹۶ موسیٰ علیہ السلام نے جانے سے پہلے اپنی قوم کی نگرانی کے لیے جو اہتمام فرمایا، یہ اُس کا بیان ہے۔ اِسے خاص طور پر نمایاں کیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کی جو لعنت اختیار کی، وہ اِس سارے اہتمام کے علی الرغم اختیار کی۔

۴۹۷ یہ شوق ایک فطری شوق ہے، اِس وجہ سے آں جناب کو اللہ تعالیٰ نے اِس پر کوئی ملامت نہیں فرمائی، بلکہ

سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴۳﴾ قَالَ يٰمُوۡسٰۤى اِنِّى اصۡطَفَيۡتُكَ
عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىۡ وَبِكَلَامِىۡ ۖ فَخُذۡ مَاۤ اٰتَيۡتُكَ وَكُنۡ مِّنَ الشّٰكِرِيۡنَ ﴿۱۴۴﴾
وَكَتَبۡنَا لَهٗ فِى الۡاَلۡوَاحِ مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ مَّوۡعِظَةً وَّتَفۡصِيۡلًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ ۚ فَخُذۡهَا

ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش آیا تو بولے: تو پاک ہے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور (گواہی دیتا ہوں کہ) سب سے پہلے ماننے والا میں ہوں[۴۹۸]۔ فرمایا: اے موسیٰ، میں نے اپنے پیغام اور کلام سے تمھیں لوگوں پر سرفرازی بخشی ہے۔ اِس لیے جو کچھ میں نے تمھیں دیا ہے، اُسے لو اور شکر گزار بن کر رہو[۴۹۹]۔ (چنانچہ) اُس کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور (دین و شریعت سے متعلق)

صرف سمجھا دیا ہے۔

۴۹۸؎ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سمجھانے کے لیے یہ طریقہ کیوں اختیار فرمایا؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ مشاہدہ حضرت موسیٰ کی اطمینان دہانی کے لیے کرایا گیا کہ خدا کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جامد اور ٹھوس ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں تو تم انسان ضعیف البنیان ہو کر کس طرح لا سکو گے۔ انسان کی قوت برداشت محدود ہے۔ اُس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں، لیکن یہ روشنی ایک حد خاص سے متجاوز ہو جائے تو آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں، بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ اُس کے کان آواز کو سنتے ہیں، لیکن اُن کے سننے کی تاب بھی بس ایک مقررہ حد ہی تک ہے، بجلی کا کڑکا ہی ذرا حد سے متجاوز ہو جائے تو سرے سے کان کے پردے ہی بے کار ہو جائیں۔ آفتاب اُس کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، مگر اُس کی روشنی اور حرارت اُسی وقت تک اُس کے لیے حیات بخش ہے، جب تک وہ نہایت ہی طویل فاصلے سے، نہ جانے کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزار کر اپنی روشنی اور حرارت اُس کو پہنچا رہا ہے۔ اگر کسی دن ذرا کرۂ ارض سے قریب آ کر اُس پر ایک نظر ڈال دے تو سارے جان دار جل بھن کر خاک اور راکھ ہو جائیں۔ تو جب اِس کائنات کی مخلوق کے مقابل میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتواں ہے تو وہ خدا کی ذات بحت کی تاب کس طرح لا سکتی ہے جو نور مطلق اور تمام چون و چگون سے ماورا اور بالاتر ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۶۰)

۴۹۹؎ یہ انداز کلام بھی قابل توجہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اِس میں نہایت لطیف طریقے سے توجہ دلائی گئی ہے کہ جو کچھ عطا کیا جا رہا ہے، وہی کم نہیں ہے، اُس پر قناعت کرو، مجھے دیکھنے کی خواہش نہ کرو۔

بِقُوَّۃٍ وَّاْمُرْ قَوْمَکَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِھَا سَاُورِیْکُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ سَاَصْرِفُ
عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا

ہر چیز کی تفصیل ہم نے تختیوں پر لکھ دی۔[۵۰۰] پھر (ہدایت کی کہ) اُنھیں مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ اُن کے (اندر لکھے ہوئے) احسن طریقے کی پیروی کریں۔[۵۰۱] (اپنی قوم کو لے کر ذرا آگے بڑھو)، میں عنقریب تمھیں نافرمانوں کے گھر دکھاؤں گا۔[۵۰۲] (تم دیکھو گے کہ) میں عنقریب اُن لوگوں کو اپنی نشانیوں سے پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور (ایسے ہیں کہ) اگر ہر قسم کی نشانیاں

۵۰۰؎ اصل میں 'مِنْ کُلِّ شَیْءٍ' اور 'لِکُلِّ شَیْءٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس طرح کے سیاق وسباق میں یہ پیش نظر موضوع ہی سے متعلق ہو کر آتے ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اِسے واضح کر دیا ہے۔ تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت موسیٰ علیہ السلام نے لکھا، بائیبل کے بیان سے دونوں ہی باتیں نکلتی ہیں۔ اِن میں سے جس کو بھی مانیے، قرآن کے الفاظ اُس کے محتمل ہیں:

''اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام اُن کو بتا دیے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں، ہم اُن سب کو مانیں گے اور موسیٰ نے خدا کی سب باتیں لکھ لیں۔'' (خروج ۲۴: ۳-۴)

''اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں ہاتھ میں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں اِدھر سے اور اُدھر سے، دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں۔ اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا تھا، وہ بھی خدا ہی کا لکھا اور اُن پر کندہ کیا ہوا تھا۔'' (خروج ۳۲: ۱۵-۱۶)

یہ امر، البتہ ملحوظ رہے کہ قرآن کے الفاظ سے اِس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ تختیوں پر صرف احکام عشرہ لکھے ہوئے تھے، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین وشریعت کی جو باتیں اُس مرحلے میں بتانی پیش نظر تھیں، وہ سب اُن میں درج کر دی گئی تھیں۔

۵۰۱؎ اصل میں 'یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِھَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں تفضیل مطلق ہے اور لوگ جو طریقے اُس زمانے میں اختیار کیے ہوئے تھے، اُن کے مقابل میں آئی ہے۔ عربی زبان میں تفضیل کے صیغے اِس پہلو سے بھی آجاتے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے کہو کہ بت پرست قوموں کی خرافات پر نہ

بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ
سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٤٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٧﴾

دیکھ لیں، پھر بھی اُن پر ایمان نہ لائیں۔ اگر ہدایت کی راہ دیکھیں تو اُسے اختیار نہ کریں اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اُس پر چل پڑیں۔ یہ اِس لیے کہ اُنھوں نے (اِس سے پہلے) ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروا بنے رہے۔[۵۰۳] ہماری نشانیوں کو جن لوگوں نے بھی جھٹلایا اور آخرت کی ملاقات کا انکار کیا ہے، اُن کے اعمال ضائع ہو گئے۔ اب کیا بدلے میں اُس کے سوا کچھ پائیں گے جو کرتے رہے ہیں[۵۰۴]؟ ۱۴۲-۱۴۷

رکھیں، بلکہ اُس پاکیزہ اور اعلیٰ و احسن طریقے کو اپنائیں جو اِن الواح میں اُن کو بتایا گیا ہے۔

۵۰۲؎ اُن قوموں کی طرف اشارہ ہے جن کے علاقوں سے بنی اسرائیل فلسطین کی طرف اپنے سفر کے دوران میں گزرنے والے تھے۔

۵۰۳؎ آگے جو کچھ پیش آنے والا تھا، اُس کی مثال سے ہدایت و ضلالت کا قانون سمجھا دیا ہے کہ تمھارے جلو میں یہ قومیں خدائی دینونت کے ظہور کی عظیم نشانیاں دیکھیں گی، لیکن اِس کے باوجود انکار کر دیں گی، اِس لیے کہ اِن میں زیادہ متکبرین ہیں اور اِس سے پہلے بھی ہماری نشانیوں کو جھٹلا چکے ہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو لوگ تکبر کے ساتھ ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیتے ہیں، اُنھیں ہم ہدایت سے محروم کر دیتے ہیں۔

۵۰۴؎ مطلب یہ ہے کہ وہی پائیں گے جو کچھ کرتے رہے ہیں۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

دین حق

اسلام، ایمان اور احسان

۱۔ عَـنْ عُـمَـرَ بنِ الْخَطَّابِ قال: بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رسول اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَـلَيْـهِ وَسَـلَّـمَ ذَاتَ يَـوْمٍ إِذْ طَـلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيدُ سَـوَادِ الشَّـعَـرِ لَا يُرَى عليه أَثَرُ السَّفَرِ ولا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ حتى جَلَسَ إلى الـنبى صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إلى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ على فَـخِـذَيْـهِ وقال يا محمد أَخْبِرْنِى عن الْإِسْلَامِ فقال رسول اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَـلَيْـهِ وَسَـلَّـمَ:الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إلا الله وَأَنَّ مُحَمَّدًا رسول اللَّهِ صَـلَّـى الـلَّـهُ عَـلَيْـهِ وَسَـلَّـمَ وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِىَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَـحُـجَّ الْبَيْـتَ إن اسْتَـطَعْتَ إليه سَبِيلًا ، قال: صَدَقْتَ، قال: فَعَجِبْنَا له يَسْـأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قال: فَأَخْبِرْنِى عن الْإِيمَانِ قال: أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِـهِ وَرُسُـلِـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ، قَالَ: صَدَقْتَ، قَـالَ: فَـأَخْـبِـرْنِـى عن الْإِحْسَانِ قال:أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لم تَكُنْ

تَرَاهُ فإنه يَرَاكَ. (مسلم، رقم 93)

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن جب کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انتہائی سفید کپڑوں اور نہایت سیاہ بالوں والا شخص نمودار ہوا ہے، اُس پر نہ سفر ہی کے کوئی آثار تھے اور نہ ہم میں سے کوئی اُسے پہچانتا تھا۔ (وہ آگے بڑھا) یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زانوں پر رکھ دیے اور بولا اے محمد مجھے بتائیے کہ اسلام کیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اِس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر استطاعت حاصل ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔ وہ بولا آپ نے صحیح کہا۔ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہمیں اُس پر تعجب ہوا کہ وہ آپ نے پوچھتا بھی ہے اور آپ کے جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر اُس نے پوچھا مجھے بتائیے کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ، اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں، اُس کے رسولوں اور یومِ آخرت کو مانو اور تم (خدا کی جانب سے) اچھی اور بری تقدیر کو مانو۔ وہ (پھر) بولا، آپ نے صحیح کہا۔ پھر اُس نے پوچھا مجھے بتائیے کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: (احسان یہ ہے) کہ تم اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو، اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں بھی دیکھ رہے تو وہ تو تمھیں دیکھ ہی رہا ہے۔

توضیح

یہ حدیثِ جبریل ہے، اس میں جبرئیل علیہ السلام نے لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض سوالات کیے ہیں۔ یہ سوال انھوں نے انسانی روپ میں ظاہر ہو کر لوگوں کی موجودگی میں آپ سے کیے تھے۔ حدیث کے ابتدائی حصے میں اسی بات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور پھر جبرئیل علیہ السلام کے سوالات کا ذکر ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اسلام کیا ہے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اسلام کو درجِ ذیل پانچ چیزوں پر مشتمل قرار دیا۔

۱۔ اِس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔

۲۔ نماز کا اہتمام کرنا۔

۳۔ زکوٰۃ ادا کرنا۔

۴۔ رمضان کے روزے رکھنا۔

۵۔ اگر استطاعت حاصل ہو تو (زندگی میں ایک دفعہ) بیت اللہ کا حج کرنا۔

یہ پانچ چیزیں ارکان اسلام کہلاتی ہیں، جو شخص ان پر کاربند ہے وہ اسلام کا حامل ہے، یعنی یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی شخص کے اسلام کو ثابت کرتی ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ایمان کیا ہے؟

اس کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کو درجِ ذیل باتوں پر مشتمل قرار دیا۔

۱۔ اللہ کو ماننا

۲۔ اُس کے فرشتوں کو ماننا

۳۔ اُس کی کتابوں کو ماننا

۴۔ اُس کے رسولوں کو ماننا

۵۔ یومِ آخرت کو ماننا

۶۔ اچھی اور بری تقدیر کو خدا کی جانب سے ماننا۔

ان میں سے پانچ چیزیں تو بالکل وہی ہیں جو قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں بیان ہوئی ہیں:

''یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔ (اِن کا اقرار ہے کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور اِنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے سنا اور سر اطاعت جھکا دیا۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اور (جانتے ہیں کہ) ہمیں لوٹ کر تیرے ہی حضور میں پہنچنا ہے۔'' (البقرۃ ۲: ۲۸۵)

چھٹی چیز یعنی اچھی اور بری تقدیر کا خدا کی طرف سے ہونا۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات علیم (ان اللہ بکل شیءعلیم) یعنی وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور قدیر (ان اللہ علی کل شیءقدیر) یعنی وہ سب کچھ کر سکتا ہے کو ماننے کا لازمی

نتیجہ ہے، جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے چھٹے جزو کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

کسی چیز کو ماننا انسان کے دل کا عمل ہے۔ دل کا یہ عمل ہی وہ چیز ہے جس کا ظہور اُن پانچ باتوں کی صورت میں ہوتا ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سوال (اسلام کیا ہے؟) کے جواب میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے تحت جو باتیں آپ نے بیان فرمائی ہیں وہ دین کا ظاہر ہیں اور یہ چھ باتیں جو انسان کے دل کا عمل ہیں اور جنھیں آپ نے ایمان کے تحت بیان فرمایا ہے، یہ دین کا باطن ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ احسان کیا ہے؟

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو، اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں بھی دیکھ رہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، جب کہ تمھیں یہ حقیقت معلوم ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

دین پر عمل کرنے میں مطلوب رویے کا نام 'احسان' ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں اپنے جواب سے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ یہ مطلوب رویہ اس حقیقت کو مستحضر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے۔

دین ـــــــ سراپا خیرخواہی

۲۔ عن تَمِیمٍ الدَّارِیِّ أَنَّ النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قال الدِّینُ النَّصِیحَۃُ قُلْنَا لِمَنْ؟ قال لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہِ وَلِرَسُولِہِ وَلِأَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِینَ وَعَامَّتِہِمْ. (مسلم، رقم ۵۵، رقم مسلسل ۱۹۶)

تمیم داری سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین خیرخواہی ہے۔ اللہ کے لیے، اُس کی کتاب کے لیے، اُس کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے حکمرانوں کے لیے اور اُن کے عوام کے لیے۔

توضیح

اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ دین انسان میں جو روح پیدا کرتا ہے وہ نصح و خیر خواہی ہے۔ سچے دین دار آدمی کا وجود اپنے سے متعلق ہر شخص کے لیے سراپا خیر خواہی ہوتا ہے۔ وہ جیسے اپنے لیے خیر کی تمنا اور بھلائی کی آرزو رکھتا ہے اسی طرح وہ دوسروں کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بتایا کہ اُس کی خیر خواہی کے دائرے میں خدا، اُس کا رسول اور اُس کی کتاب بھی آتی ہے اور مسلمانوں کے عوام اور اُن کے حکمران بھی آتے ہیں۔

خدا اور رسول کی خیر خواہی سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی اِس رزم گاہ خیر وشر میں انسان طاغوت کی مخالفت اور خدا اور اُس کے رسول کی نصرت کرے۔ کتاب اللہ کی خیر خواہی یہ ہے کہ وہ اِس پر ایمان لائے، خود بھی اس پر کار بند ہو اور دوسروں کو بھی اس پر کار بند ہونے کی دعوت دے۔ عام مسلمانوں اور اُن کے حکمرانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ انسان ہر پہلو سے اور ہر حال میں اُن کا بھلا چاہے۔

محمد وسیم اختر مفتی

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

[''سیر سوانح'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۲)

اواخر ۱۱ھ میں حضرت ابوبکر نے خالد کو یمامہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا جہاں مسیلمہ بنو حنیفہ کے چالیس ہزار جنگ جو اشخاص کے ساتھ مقیم تھا۔مسیلمہ کا لشکر ایک لاکھ پر مشتمل تھا جبکہ اہل ایمان دس ہزار سے کچھ اوپر تھے۔ خالد نے مقدمہ پر شرحبیل بن حسنہ اور میمنہ و میسرہ پر زید اور ابوحذیفہ کو مقرر کیا۔رات کے وقت مقدمہ کا گزر چالیس سے زیادہ سواروں پر مشتمل ایک دستے پر ہوا جس کا تعلق مسیلمہ کے قبیلے بنو حنیفہ سے تھا اور یہ بنوتمیم و بنو عامر سے قصاص کا کوئی قضیہ نمٹا کر آ رہا تھا۔انھیں خالد کے پاس لایا گیا تو انھوں نے منصب نبوت کے بارے میں ان کی راے پوچھی۔ان کا جواب تھا،ایک نبی ہمارا ہے اور ایک تمھارا۔خالد نے ان سب کو قتل کرا دیا،محض ان کے سردار مجاعہ بن مرارہ کو زندہ رہنے دیا، کیونکہ وہ زبردست حربی صلاحیتیں رکھتا تھا۔ انھوں نے اپنی فوج کو ایک بلند جگہ پر ٹھہرایا جہاں سے یمامہ دکھائی دیتا تھا۔مہاجرین کا علم سالم نے اور انصار کا ثابت بن قیس نے اٹھا رکھا تھا۔اسلامی فوج میں شامل بدو جنگ کے پہلے ہلے ہی میں پسپا ہو گئے۔بنو حنیفہ خالد کے خیمے میں داخل ہو کر ان کی اہلیہ ام تمیم کو قتل کرنے لگے تھے کہ مجاعہ نے ان کو بچایا۔مہاجرین و انصار نے جو صرف اڑھائی ہزار تھے، جم کر حملہ کیا۔خالد ایک زوردار حملہ کر کے مسیلمہ کے پاس پہنچ چکے تھے،لیکن پھر پلٹ کر فوجیوں کی صفوں کے بیچ میں کھڑے ہو گئے اور انا ابن الولید،

انا ابن عامر وزید کہہ کر دعوت مبارزت دی۔ کئی سورما ان کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ جنگ کا بازار گرم ہوا تو وہ پھر مسیلمہ کے قریب گئے اور اسے قبول حق کی دعوت دی، لیکن اس نے گردن ہلا کر انکار کیا۔ جنگ کے دوران میں مسیلمہ کا قریبی ساتھی رجال بن عنفوہ زید بن خطاب کے ہاتھوں مارا گیا، مسلمانوں میں سے ثابت بن قیس، سالم اور ان کے آقا ابوحذیفہ نے شہادت پائی۔ مسیلمہ کی فوج شکست کھا کر ایک قلعہ نما باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔ اسلامی فوج نے باغ کا محاصرہ کر لیا، براء بن مالک کے کہنے پر انھیں ایک زرہ پر بٹھا کر نیزوں کی انیوں کے ذریعے بلند کر کے باغ کے اندر پھینکا گیا۔ انھوں نے اندر گھس کر دس سے زیادہ مرتدوں کو قتل کیا اور لڑتے بھڑتے دروازہ کھول دیا۔ باقی مسلمان بھی نعرۂ تکبیر بلند کر کے داخل ہوئے۔ سخت جنگ ہوئی، مسیلمہ کے دس ہزار فوجی مارے گئے، جبکہ چھ سو اہل ایمان نے جام شہادت نوش کیا۔ کثرت اموات کی وجہ سے اس باغ کا نام ہی حدیقۃ الموت پڑ گیا۔ مسیلمہ کو وحشی بن حرب اور ابودجانہ انصاری نے جہنم واصل کیا۔ اختتام جنگ پر خالد نے یمامہ کے قلعوں کے گردوپیش سے مال غنیمت جمع کرنے کے لیے اپنے دستے بھیجے۔ وہ ان قلعوں پر حملہ کرنا چاہتے تھے جن میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے علاوہ کوئی نہ رہا تھا۔ اس موقع پر مجاعہ نے انھیں دھوکا دیا۔ اس نے کہا، کئی جنگ جو مرد ان میں موجود ہیں، مجھے اجازت دیں کہ ان سے صلح کی بات کروں پھر عورتوں سے جا کر کہا، خود اور زرہیں پہن کر قلعوں کی منڈیروں پر آ جائیں۔ خالد نے صلح کر لی اور اہل یمامہ کو اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔ سب کے سب دوبارہ مسلمان ہو گئے۔

مثنیٰ بن حارثہ ایرانی سرحد کے قریب آباد ایک عرب قبیلے کے لیڈر تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ حروب ردہ ختم ہونے کے بعد انھوں نے عراق کے اندر جا کر کارروائیاں کرنا شروع کیں۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے ایرانی فوج انھیں پکڑ نہ پاتی۔ حضرت ابوبکر نے انھیں قبیلے کا کمانڈر مقرر کر کے رضا کاروں کی فوج بھرتی کرنے کی اجازت دی اور خالد بن ولید کے ماتحت کر دیا جو جنگ یمامہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ محرم ۱۲ھ (مارچ ۶۳۳ء) میں حضرت ابوبکر نے ایک طرف خالد کو جنوبی عراق (lower Mesopotamia) کی طرف جانے کا حکم دیا اور دوسری طرف عیاض بن غنم کو اس کے شمال کا رخ کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے خالد کو ہدایت کی کہ پہلے ابلّہ (ابلق) جائیں پھر عراق میں اس کے زیریں حصے سے داخل ہوں۔ وہاں کے باشندگان کو اللہ کی بندگی کی دعوت دیں، یہ انھیں قبول نہ ہو تو جزیہ دیں اور اگر اسلام و جزیہ دونوں میں سے کوئی بات نہ مانیں تو ان سے قتال کریں۔ فوج میں کسی کو زبردستی بھرتی نہ کریں، ارتداد میں مبتلا ہونے والے مسلمانوں کو ان کے رجوع کے باوجود فوج میں شامل نہ کریں۔ حضرت ابوبکر نے یہ بھی فرمایا، میں خالد بن ولید کے ذریعے نصاریٰ کو شیطان کی اکساہٹوں پر عمل کرنے سے غافل کر دوں

گا۔مشہور روایت کے مطابق خالد یمامہ سے مدینہ آنے کے بجاے سیدھا عراق گئے اور بصرہ والا راستہ اپنایا۔انھوں نے اٹھارہ ہزار جوانوں پر مشتمل اپنی فوج کو تین حصوں میں بانٹ دیا جنھوں نے مختلف راستوں پر سفر کیا، پہلے حصے کے سالار مثنیٰ، دوسرے کے عدی بن حاتم تھے، تیسرے کی قیادت خود خالد نے کی ۔ یہ سب ابلق (ابلہ) کے قریب حفیر کے مقام پر اکٹھے ہوئے۔خالد نے یہاں کے ایرانی گورنر ہرمز کو خط لکھ کر اسلام لانے کی دعوت دی۔اس نے جنگ کو ترجیح دی اور بصرہ کے نواحی مقام کاظمہ میں اپنی فوج جمع کر لی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے خالد بن ولید نے ہرمز کو دعوت مبارزت دی۔ دو ضربوں کا تبادلہ ہوا تھا کہ خالد نے اسے گرفت میں لے لیا۔اس کے فوجی دوڑتے آئے، لیکن اسے قتل ہونے سے نہ بچا سکے، قعقاع بن عمرو نے انھیں پرے کر دیا تھا۔ایرانیوں کو شکست ہوئی،ان کے تیس ہزار جوان مارے گئے ۔ مال غنیمت اس قدر تھا کہ ایک ہزار اونٹوں پر پورا آیا۔جسر پہنچ کر خالد نے زِر بن کلیب کے ہاتھوں خمس مدینہ روانہ کیا۔حضرت ابوبکر نے ہرمز کا ساز و سامان خالد کو دے دیا،صرف اس کی ٹوپی کی قیمت ایک لاکھ درہم لگی جبکہ گھوڑا بھی انتہائی بیش قیمت تھا۔

۱۲ھ (۶۳۳ء): ہرمز نے مرنے سے پہلے شاہ ایران اردشیر سے مدد طلب کی تو اس نے ایک جرنیل قارن کی کمان میں تازہ دم فوج بھیجی۔ یہ اس وقت پہنچی جب ایرانی کاظمہ میں پٹ کر فرار ہو رہے تھے اور مثنیٰ ان کے تعاقب میں تھے۔قارن نے مذار کے مقام پر پڑاؤ ڈالا،اس نے بھگوڑوں کو عار دلائی اور انھیں پلٹ کر اسلامی فوج پر حملہ کرنے پر اکسایا۔مثنیٰ کو معلوم ہوا تو وہ بھی اپنی قلیل فوج کے ساتھ اس کے قریب مقیم ہو گئے اور خالد کو خط لکھ کر حالات سے مطلع کیا۔خالد اس اندیشے سے کہ قارن مثنیٰ کی مختصر فوج کو تباہ نہ کر دے، تیزی سے سفر کرتے ہوئے مذار پہنچے۔ کاظمہ سے بھاگے ہوئے جرنیل قباذ اور انوشجان اپنی ذلت کا بدلہ لینا چاہتے تھے،خالد نے بھی دشمن کو پہل کرنے کا موقع نہ دیا۔قارن نے مبازرت کے لیے للکارا،اسے معقل بن اعشیٰ نے جہنم رسید کیا۔قباذ عدی بن حاتم طائی کے ہاتھوں مارا گیا اور عاصم نے انوشجان کو ٹھکانے لگایا۔ایرانیوں نے پھر راہ فرار پکڑی اور بھاگتے بھاگتے مزید تیس ہزار سپاہیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بے شمار ایرانی کشتیوں پر سوار ہو کر بھاگ لیے، باقیوں کو قید کر لیا گیا،ان میں حسن بصری کے والد بھی تھے۔خالد نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سعید بن نعمان کو دے کر حضرت ابوبکر کی خدمت میں مدینہ بھیج دیا اور مقامی آبادی پر جزیہ عائد کر دیا۔

جنگ مذار میں شکست کے بعد ایرانی بادشاہ اردشیر نے دو بڑے جرنیلوں اندرزغر اور بہمن جاذویہ کی سرکردگی میں پھر ایک فوج روانہ کی جو دجلہ و فرات کے کنارے بسنے والے قبائل اور بکر بن وائل پر مشتمل تھی۔ صفر ۱۲ھ (اپریل

۶۳۳ء) میں یہ ولجہ کے مقام پر پہنچی تو خالد کو خبر ہوئی، وہ فوراً فوج لے کر آئے اور ایرانیوں پر دھاوا بول دیا۔ سخت لڑائی ہوئی، فیصلہ ہوتا نظر نہ آ رہا تھا کہ جیش اسلامی کے دو تازہ دم دستے نمودار ہوئے جو خالد ولجہ پہنچنے سے پہلے پیچھے چھپا آئے تھے۔ ان دستوں نے فارسی لشکر کے پچھلی طرف سے ہلہ بولا، جبکہ اگلی طرف خالد لڑ رہے تھے۔ اس جنگی اسٹریٹیجی کو double envelopment manoeuvre کہا جاتا ہے۔ درمیان میں پھنسے ہوئے ایرانیوں کو راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔ ستر ہزار مارے گئے، اندرزغر بھاگ نکلا لیکن اس بیابان میں اسے کہیں پانی نہ ملا اور پیاس سے مارا گیا۔ ایک روایت ہے کہ جنگ ولجہ میں خالد نے ایک ایرانی سورما کو قتل کیا جسے ہزار جوانوں کے برابر سمجھا جاتا تھا پھر اس پر بیٹھ گئے اور اسی حالت میں وہیں کھانا منگوا کر کھایا۔

جنگ ولجہ میں ایرانی فوج میں شامل بکر بن وائل کے کچھ لوگ بھی مارے گئے تھے۔ ان کے لواحقین نے اردشیر کو خط لکھا تو اس نے اپنے جرنیل جابان (باہان یا واہان) کی قیادت میں مدد بھیجی۔ ایرانی اور بکری فوجی الیس کے مقام پر جمع ہوئے۔ کھانے کا وقت ہوا، انھوں نے چٹائیاں بچھا کر کھانا شروع ہی کیا تھا کہ خالد اپنا لشکر لے کر پہنچ گئے۔ انھوں نے آواز دے کر ان بدوؤں کو بلایا جو ایرانیوں سے مل گئے تھے۔ ایک ہی شخص، بنو جذرہ کا مالک بن قیس نکلا تو خالد نے بے وفائی کرنے پر اس کی گردن اڑا دی۔ اب ایرانیوں نے ہتھیار اٹھا لیے اور شدید جنگ شروع ہو گئی۔ ان کا سالار مالک بن قیس مارا گیا لیکن جابان (واہان) کے دلیری دلانے پر وہ ڈٹ گئے۔ انھیں بہمن کی قیادت میں آنے والی کمک کا انتظار تھا، لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اسلامی فوج کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ خالد نے سپاہیوں کو ہدایت کی، ایرانیوں کو قید کرنے کی کوشش کی جائے، قتال صرف ہتھیار نہ ڈالنے والوں ہی سے کیا جائے۔ چنانچہ بے شمار اسیروں کو ہانکا گیا اور لاتعداد جنگ جوؤں کی گردنیں کاٹ کر دریا میں پھینکی گئیں۔ یہ سلسلہ تین دن جاری رہا یہاں تک کہ دریا میں صرف خون بہنے لگا۔ مقتولین کا شمار ستر ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک کیا گیا۔ ایرانیوں کا لگایا ہوا کھانا مسلمانوں نے تناول کیا۔ جنگ الیس میں حصہ لینے والے تمام ایرانی منیشیا (امغیشیا) کے شہر سے آئے تھے۔ خالد بن ولید نے اسے تباہ کرنا بھی ضروری سمجھا، وہاں سے بے شمار مال غنیمت حاصل ہوا۔ ہر سوار کو پندرہ ہزار درہم زائد دیے گئے۔ خالد نے خمس اور قیدی مدینہ روانہ کیے، حضرت ابوبکر نے جنگ کے واقعات سن کر فرمایا، ''عورتیں اب خالد جیسا بیٹا جنم نہیں دے سکتیں۔'' بیمار شاہ اردشیر شکست کے صدمے کی تاب نہ لا سکا اور چل بسا۔

ولجہ سے رخصت ہو کر خالد بن ولید نے حیرہ کے خورنق اور سدیر محلات کے پاس پڑاؤ ڈالا اور گرد و پیش کے قلعوں کا محاصرہ کرنے کے لیے اپنے دستے بھیجے۔ حیرہ کے نصرانی حاکم عبدالمسیح بن بقیلہ نے اپنے بیٹے عمرو کی ترغیب پر صلح

کرنے کو ترجیح دی۔ خالد نے عبدالمسیح کے پاس ایک چھوٹا سا بٹوا دیکھا جس میں زہر تھا۔ انھوں نے پوچھا، یہ کیوں رکھا ہے؟ اس نے جواب دیا، اگر مجھے قوم کی طرف سے کسی ناپسندیدہ بات کا سامنا کرنا پڑا تو میں اسے کھا کر خود کشی کر لوں گا۔ خالد نے بٹوا لے کر کہا، کوئی شخص وقت مقررہ سے پہلے نہیں مر سکتا۔ پھر بسم اللّٰہ خیر الاسماء، رب الارض والسماء الذی لا یضر مع اسمہ داء، الرحمٰن الرحیم ''اللہ کے نام سے جو بہترین نام ہے، زمین و آسمان کا رب ہے جس کا نام لینے سے کوئی بیماری نقصان نہیں دیتی، رحمان و رحیم ہے''، پڑھ کر زہر منہ سے لگا لیا۔ پاس کھڑے ہوئے جرنیل ان کو روکنے کے لیے لپکے لیکن وہ زہر نگل چکے تھے۔ ان پر غشی طاری ہوئی، پسینہ آیا، لیکن جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ ابن بقیلہ نے کہا، اے عرب کے لوگو! بخدا، تم جس چیز پر چاہو گے قبضہ کر لو گے۔ اس صلح سے اسلامی فوج کو فوری طور پر چار لاکھ درہم حاصل ہوئے۔ صلح کے بعد کرامہ (شیما) بنت عبدالمسیح ایک صحابی شویل (زکریا بن یحییٰ) کے حوالہ کی گئی۔ زکریا بن یحییٰ نے کہا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرہ کے محلات کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی تب اسیر جنگ کے طور پر بنت بقیلہ انھیں دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ انھوں نے دو اصحاب محمد بن مسلمہ اور محمد بن بشیر کی گواہی بھی پیش کی تو خالد نے اسے ان کے حوالہ کر دیا۔ اس وقت وہ بوڑھی ہو چکی تھی، اس نے فدیہ دے کر اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ حیرہ فتح کرنے کے بعد خالد نے آٹھ رکعات نوافل ایک ہی سلام سے ادا کیے۔

حیرہ کے بعد سواد عراق کے قصبوں بانقیا اور برسوما کے حاکم بصبہری بن صلوبا نے ایک لاکھ درہم سالانہ پر صلح کی۔

خالد ایک سال تک ایران میں گھومتے پھرتے رہے۔ انھوں نے مقامی امرا کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے متعدد خطوط لکھے۔ اسی دوران میں شاہ اردشیر اور اس کا بیٹا شیریں قتل ہوئے۔ تاہم، ایرانیوں کی بھاری فوج جیش خالد اور ایرانی دار الخلافہ مدائن کے بیچ حائل رہی۔

۱۲ھ (۶۳۳ء) ہی میں انبار فتح ہوا۔ وہاں شیرزاد کی حکومت تھی جس نے شہر کے گرد خندق کھود رکھی تھی۔ دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو خالد نے سپاہیوں کو تیروں کی سیدھی بوچھاڑ کرنے کا حکم دیا۔ ایک ہزار سے زائد انباریوں کی آنکھیں پھوٹ گئیں، اس وجہ سے اس جنگ کو آنکھیں پھوٹنے والی جنگ (غزوۃ ذات العیون) کہا جاتا ہے۔ شیرزاد نے صلح کی پیش کش کی، لیکن خالد کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا۔ خالد نے کمزور اور مریل اونٹ ذبح کر کے خندق میں بھر دیے اور اسے عبور کر لیا۔ تب شیرزاد نے محفوظ جگہ جانے کی درخواست کی اور شہر چھوڑ دیا۔ بوازیج اور کلواذی کے رہنے والوں نے بھی صلح کی۔ خالد بن ولید نے زبرقان بن بدر کو انبار پر نائب مقرر کر کے عین التمر کا رخ کیا۔

عین التمر پر مہران بن بہرام کی حکومت تھی، ارد گرد آباد عرب قبائل تغلب وایاد اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

خالد بن ولید کی آمد کی خبر ملی تو عرب لیڈر عقہ نے مہران سے کہا، میں عربوں کے جنگ کرنے کے طریقوں سے واقف ہوں، مجھے خالد سے نمٹنے دیں۔اس نے کچھ پس و پیش کے بعد اجازت دے دی۔فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، خالد نے عقہ کو دیکھا تو اپنے میمنہ و میسرہ کو پیش قدمی سے روک دیا اور خود آگے بڑھے۔عقہ فوج کی صفیں درست کرارہا تھا، انھوں نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا اور قید کر لائے۔اس کے بیشتر فوجی بھی خالد کی قید میں آ گئے۔یوں جنگ عین التمر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔مہران نے فوج کی ہزیمت کی خبر سنی تو قلعہ چھوڑ کر فرار ہوا۔اس کے جانے کے بعد بھگوڑوں نے قلعہ میں پناہ لے لی۔خالد نے قلعے کا محاصرہ کر لیا، جب یہ ان پر شاق ہوا تو صلح کی درخواست کی۔خالد کے فیصلے کے مطابق عقہ اور تمام اسیروں کی گردنیں اڑا دی گئیں۔چالیس لڑکے قفل بند کنیسہ میں انجیل کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔خالد نے انھیں چھڑا کر امرا میں بانٹ دیا۔انھی میں محمد بن سیرین کے والد سیرین تھے جو انس بن مالک کے حصہ میں آئے۔ولید بن عقبہ خمس لے کر مدینہ پہنچے، لیکن سیدنا ابوبکر نے اسے عیاض بن غنم کو بھجوا دیا جو دومۃ الجندل کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور خود بھی دشمن کے محاصرے میں تھے۔ولید کی تجویز پر عیاض نے خالد سے مدد طلب کر لی۔

خالد بن ولید نے عین التمر پر عویمر بن کاہن (کاہل) کو نائب مقرر کر کے دومۃ الجندل کا رخ کیا۔وہاں کے لوگوں نے ان کے آنے کی خبر سن کر بہرا، تنوخ، کلب اور غسان قبائل سے مدد مانگ لی۔فوج جمع ہو گئی تو اکیدر بن عبدالملک اور جودی بن ربیعہ میں قیادت کا اختلاف ہو گیا۔اہل دومہ نے اکیدر کے زیادہ ذی صلاحیت ہونے کے دعووں کو نہ مانا تو وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔خالد کے حکم پر عاصم اکیدر کو پکڑ لائے تو انھوں نے اس کا سر قلم کرا دیا۔پھر وہ دومۃ الجندل پہنچے، جودی وہاں کا سپہ سالار بن چکا تھا۔خالد نے شہر کے دو اطراف سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا، بدوؤں کی آدھی فوج عیاض کو دی جبکہ دوسری نصف کو اپنی فوج کے ساتھ ملا لیا۔جنگ شروع ہوئی تو جودی کو خالد نے پکڑا اور اقرع بن حابس و دیعہ کو گرفتار کر لائے۔دومہ کی فوج نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی۔بنو تمیم نے قلعہ سے باہر رہ جانے والوں کو فرار ہونے میں مدد دی جبکہ خالد نے اپنی زد میں آنے والے کسی دشمن کو نہ چھوڑا۔انھوں نے جودی اور اس کے تمام ساتھیوں کو ختم کر دینے کا حکم دیا، البتہ بنو کلب کے قیدیوں کو چھوڑ دیا، کیونکہ عاصم اور اقرع انھیں امان دے چکے تھے۔پھر خالد نے قلعے کا دروازہ اکھڑوایا اور قلعہ میں داخل ہو کر جنگ کے قابل سب مردوں کو قتل کرا دیا۔انھوں نے باقی قیدیوں کو فروخت کر دیا اور خود جودی کی بیٹی کو خریدا جو بے حد خوب صورت تھی۔خالد نے اقرع کو انبار بھیج دیا اور خود کچھ دیر دومۃ الجندل میں قیام کرنے کے بعد حیرہ لوٹ گئے۔

خالد بن ولید دومۃ الجندل میں مصروف عمل تھے کہ ایرانیوں نے الجزیرہ کے عربوں کے ساتھ مل کر انبار پر حملہ کرنے اور زبرقان بن بدر کو وہاں سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔ زبرقان نے حیرہ کے عامل قعقاع کو اطلاع کی۔ اسی اثنا میں خالد واپس آ چکے تھے، انھوں نے فوج دے کر قعقاع کو روانہ کر دیا۔ حُصید کے مقام پر ان کی ایرانی لشکر سے مڈبھیڑ ہوئی، روزبہ اور زرمہران کے کمانڈر تھے۔ سخت لڑائی کے بعد عجمیوں نے شکست کھائی۔ قعقاع نے زرمہر کو اور عصمہ بن عبداللہ نے روزبہ کو قتل کیا۔ شکست خوردگان نے خنافس میں پناہ لی۔ ابولیلیٰ سعدی نے ان کا پیچھا کیا تو وہ مصیّخ (Muzayyah) پہنچ گئے۔ عجمی اور بدو وہاں سانس نہ لینے پائے تھے کہ خالد بن ولید نے ان پر شب خون مارا۔ سوتے ہوئے دشمنوں میں سے بہت کم بچنے پائے۔ ثنیّ (Saniyy) اور زمیل (Zumail) بھی اسی طرح کے واقعات تھے (رمضان ۱۲ھ، نومبر ۶۳۳ء) جن میں خالد نے بنوتغلب کے خلاف رات کے اندھیرے میں اچانک کارروائی کی۔ اس طرح surprise attack کر کے انھوں نے دشمن کو کوئی کارروائی کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

دومۃ الجندل سے واپسی پر خالد نے عزم کیا کہ وہ ایرانی دارالخلافہ مدائن پر حملہ کریں، لیکن ایسا اس لیے نہ ہو سکا کہ انھیں خلیفۂ اول کی منظوری حاصل نہ تھی۔

۱۲ھ کا رمضان خالد نے شام، عراق اور الجزیرہ کی سرحدوں پر واقع مقام فراض میں گزارا۔ رومیوں کو ان کی موجودگی کی اطلاع ملی تو غضب ناک ہو گئے۔ انھوں نے تغلب، ایاد اور نمر قبائل سے مدد لی اور خالد کو دعوت حرب دی۔ دریاے فرات دونوں فوجوں کے بیچ میں حائل تھا۔ اہل روم نے خالد کو دریا پار کرنے کی دعوت دی، لیکن خالد نے انھی کو فرات عبور کرنے کو کہا۔ ۱۵ ذی قعد ۱۲ھ (۲۱ جنوری ۶۳۴ء) کو شدید جنگ ہوئی جس میں ایک لاکھ جانیں گئیں اور ایرانیوں، رومیوں اور عرب عیسائیوں کی متحدہ فوج کو شکست ہوئی۔ خالد نے فراض میں مزید دس دن قیام کیا پھر حیرہ جانے کا اعلان کیا۔ عاصم مقدمہ میں تھے اور شجرہ بن اعز ساقہ کی راہ نمائی کر رہے تھے۔ خالد لشکر کے پچھلے حصے، ساقہ میں رہے، لیکن پھر چند ساتھیوں کو لے کر ایسی راہ سے مکہ کا قصد کیا جس پر پہلے کسی نے سفر نہ کیا تھا، مسجد حرام پہنچے، حج ادا کیا اور لشکر کے حیرہ پہنچنے سے پہلے لوٹ کر واپس ساقہ میں شامل ہو گئے۔ ان کے ساتھ جانے والوں کے سوا کسی کو علم نہ ہو سکا کہ وہ حج پر گئے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوبکر کو بھی اس وقت معلوم ہوا جب وہ واپس جا چکے تھے۔

عراق میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سیدنا ابوبکر نے بیک وقت چار فوجیں شام (Levant) بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر شام کے سالار ابوعبیدہ بن جراح نے کمک مانگ لی۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر نے حضرت عمر، حضرت علی اور دیگر اہل راے سے مشورے کے بعد خالد بن ولید کو قیادت سونپنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے خط لکھ کر پہلے تو

خالد کو خفیہ حج کرنے پر سرزنش کی پھر شام جانے کا حکم دیا۔ خالد عراق سے ہلنا نہ چاہتے تھے، کیونکہ ساسانی دارالخلافہ مدائن فتح کرنا ان کا مطمح نظر تھا، وہ بہت جز بز ہوئے اور اسے عیسر بن ام شملہ (عمر بن خطاب) کا مشورہ قرار دیا۔ عراق سے شام جانے کے دو راستے تھے، ایک دومۃ الجندل (آج کل کے سعودی عرب میں سکاکا) سے، دوسرا عراقی شہر الرقہ سے ہو کر گزرتا تھا۔ خالد نے دونوں راستے اختیار نہ کیے، کیونکہ دومہ کا راستہ لمبا تھا اور عراقی رستے میں عراقی فوج سے مڈبھیڑ کا خطرہ تھا۔ اس لیے انھوں نے صحراے شام کے چھوٹے راستے سے ہو کر جانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۳ھ کے اوائل (فروری ۶۳۴ء) میں انھوں نے مثنیٰ بن حارثہ کو عراق کا کمانڈر مقرر کیا اور ساڑھے نو ہزار کی فوج لے کر شام کی طرف روانہ ہوئے۔ اپنے گائیڈ رافع بن عمیرہ طائی کی راہ نمائی میں خالد نے سماوہ کے بیابان اور قراقر کی وادی کو عبور کیا، ان جنگلوں، وادیوں، پہاڑوں اور راستوں کو طے کیا جہاں سے شاید ہی کوئی گزرا ہو۔ دو دن کے سفر میں سپاہیوں کو پانی کا ایک قطرہ نہ ملا، اس کے بعد کہیں ایک نخلستان کی صورت نظر آئی۔ خالد نے اونٹوں کو جگالی سے روکنے کے لیے ان کے منہ باندھ دیے اور ایسے مواقع بھی آئے کہ انھیں ذبح کر کے ان کے پیٹ کا پانی پیا۔ آخر کار عراق کی سرحد سے لے کر شام تک محیط ہونے والا یہ وسیع بیابان اپنے لشکر سمیت صرف پانچ دنوں میں: طبری (نو دن: ابن کثیر) عبور کر لیا۔ سب سے پہلے انھوں نے سوا، تدمر (Palmyra)، اروکہ (ارک) اور سخنہ کے قلعے فتح کیے پھر بصریٰ کا رخ کیا۔ درۂ عقاب سے گزرتے ہوئے وہ دمشق کو پیچھے چھوڑ آئے تھے، مرج راہت پہنچے تو وہاں کے غسانی باشندے کوئی میلہ منا رہے تھے۔ ان کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے خالد سے شکست کھا کر یہاں پناہ لی تھی۔ خالد نے ایک مختصر حملہ کیا اور کچھ مال غنیمت اور کچھ قیدی حاصل کر کے یہ شہر خالی کر دیا۔ ان کا مقصد اگلی مہمات کے لیے عقب کو محفوظ بنانا تھا۔ خالد کی آمد کی خبر سن کر ابوعبیدہ بن جراح نے شرحبیل بن حسنہ کو چار ہزار جوان دے کر بصریٰ کا محاصرہ کرنے کے لیے بھیجا۔ بازنطینی اور عرب عیسائیوں کی ایک بڑی فوج نے شرحبیل کی فوج پر اچانک حملہ کیا، وہ شرحبیل کی قوت منتشر کرنے کو تھی کہ خالد کا گھڑ سوار دستہ آن پہنچا اور رومی فوج پر عقب سے حملہ کر دیا۔ اس نے بھاگ کر قلعے میں پناہ لے لی، اسی اثنا میں ابوعبیدہ بھی فوج لے کر پہنچے اور خالد کی کمان میں آ گئے۔ اسلامی فوج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ (جولائی ۶۳۴ء) کے وسط میں قلعہ فتح ہوا، اس کے ساتھ ہی غسانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ بلال بن حارث مزنی مال غنیمت لے کر مدینہ گئے۔

خالد بصریٰ میں تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ رومی فوج اجنادین (موجودہ اسرائیل کے مقام بیت شمش کے جنوب میں واقع شہر) میں جمع ہو رہی ہے۔ انھوں نے یرموک سے یزید بن ابوسفیان، وادئ عربہ سے عمرو بن عاص اور حوران

سے ابوعبیدہ اور شرحبیل کو بلا لیا۔ ایک ہفتے کے اندر یہ سب کمانڈر جمع ہو گئے تو اسلامی فوج کی تعداد بیس ہزار ہو گئی، جبکہ رومیوں کی نفری ساٹھ ہزار تھی۔ اسلامی فوج حسب معمول تین حصوں میں منقسم تھی، قلب کے کمانڈر معاذ بن جبل تھے، خالد اور عمرو بن عاص ان کے ساتھ تھے۔ میسرہ کی کمان سعید بن عامر اور میمنہ کی عبدالرحمان بن ابوبکر کے پاس تھی۔ یزید ساقہ میں تھے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے خالد نے سپاہیوں سے خطاب کیا اور انھیں ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔ جنگ کا پہلا دن: رومیوں نے پیادہ (infantary) فوج کے ذریعے حملہ کیا جس کی تیراندازی سے کئی مسلمان شہید اور دوسرے زخمی ہو گئے۔ اس موقع پر خالد نے رومیوں کو دعوت مبارزت دی۔ دوبدو لڑائی جاری تھی کہ انھوں نے عمومی حملے کا حکم دے دیا، لیکن غروب آفتاب تک کسی فوج کا پلہ بھاری نہ ہو سکا۔ دوسرا دن: تھیوڈور نے خالد کو قتل کرنے کا پلان بنایا، لیکن اس کے خفیہ طور پر بھیجے ہوئے دستے کو ضرار نے مار بھگایا۔ اب اس نے خالد کو دعوت مبارزت دی۔ دوبدو مقابلے میں وہ خالد پر جھپٹا اور چلا کر دس رومی سپاہیوں کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔ قریب پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ وہ رومی لباس پہنے ہوئے مسلمان ہیں اور ضرار ان کی سربراہی کر رہے تھے۔ ضرار نے رومی جیکٹ اتار پھینکی اور ایک وار کر کے تھیوڈور کا کام تمام کیا۔ کمانڈر کے مرنے سے رومی بازنطینی فوج گڑبڑا گئی، اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اسلامی فوج نے زوردار حملہ کر دیا۔ بہت جانی نقصان اٹھانے کے باوجود وہ پسپا نہ ہوئے تو خالد نے کیمپ کی حفاظت پر مامور یزید بن ابوسفیان کے دستے کو بھی بلا لیا۔ اس آخری ہلے نے رومیوں کو ڈھیر کر دیا۔ ان میں سے کئی جان بچا کر غزہ، جافہ اور یروشلم کی طرف بھاگے۔ خالد نے اپنے گھڑسواروں کو ان کا پیچھا کرنے کا حکم دیا، نتیجہ میں بھگوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ جنگ اجنادین psychological warfare کی بہترین مثال ہے۔ اس میں خالد نے عرب کی مروجہ جنگی چالوں کو ایک باقاعدہ اسٹریٹیجک نظام کی شکل دے دی۔

۲۹ جمادی الاولیٰ (۳۰ جولائی ۶۳۴ء) کو اجنادین میں فتح حاصل کرنے کے بعد خالد بن ولید دمشق روانہ ہو گئے جہاں ابوعبیدہ بن جراح محاصرہ ڈالے ہوئے تھے۔ یہ محاصرہ ۲۱ جمادی الثانی ۱۳ھ سے لے کر ۲۰ رجب ۱۳ھ (۲۱ اگست تا ۱۹ ستمبر ۶۳۴ء) تک جاری رہا۔ ہرقل کا داماد تھامس یہاں کا کمانڈر تھا، اس نے ایشیا میں مقیم ہرقل سے مدد مانگ لی۔ خالد نے ہرقل کی کمک کو روکنے کے لیے اپنی فوج ٹکڑیوں میں بانٹ کر دمشق کو آنے والے تمام راستوں پر متعین کر دی، ایک دستہ فخل بھی بھیجا۔ درۂ عقاب پر ان کی فوج کی ہرقل کی فوج سے جنگ ہوئی۔ تیس دن کے محاصرے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی یک فطریت پر اعتقاد رکھنے والے ایک (mono physite) عیسائی پادری نے خالد کو بتایا کہ فصیل شہر کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں رات کے وقت بہت کم پہرہ رہتا ہے، وہاں سے شہر پر قبضہ کرنا

آسان ہے۔ جب خالد نے وہاں سے داخل ہوکر مشرقی دروازہ کھول دیا اور اسلامی فوج شہر میں داخل ہونے لگی تو تھامس نے باب الجابیہ پر متعین نائب کمانڈر (2nd in command) ابوعبیدہ بن جراح سے صلح کی بات چلا کر امان حاصل کر لی۔ اس طرح اس نے دمشق میں تمام بازنطینی فوج (garrison) بحفاظت نکال کر انطاکیہ (Antioch) روانہ کر دی جہاں ہرقل منتقل ہو چکا تھا۔ اس کی چال سے خالد کو بہت قلق ہوا۔ تاہم، انھوں نے معائدۂ امن کا پاس کیا۔ وہ اس تاثر سے بچنا چاہتے تھے کہ اسلامی فوج امان دے کر پھر جاتی ہے اس لیے امان کی مقررہ مدت: تین دن گزرنے کے بعد اپنے گھڑ سوار دستے (cavalry) کو سادہ کپڑوں میں ملبوس کر کے رومی فوج (garrison) کا تیز رفتاری سے پیچھا کیا اور انطاکیہ پہنچنے سے پہلے ہی اسے جا لیا۔ جبل انصاریہ سے آگے مرج الدیباج نامی ایک سطح مرتفع تھی جہاں شدید بارش سے بچنے کے لیے رومی فوج ڈیرہ ڈالے ہوئی تھی۔ خالد کے جاسوس رومی فوج کی پوزیشن کی تمام تفصیل دے چکے تھے۔ انھوں نے ضرار بن ازور کی کمان میں ایک ہزار سپاہیوں کے دستے کو فوج کے جنوب سے اور رافع بن عمیر کی سربراہی میں ایک ہزار جنگ جوؤں کے دوسرے دستے کو مشرقی جانب سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رومی فوج کو حملہ ہونے کے بعد ہی خالد کی آمد کی خبر ہوئی۔ ابھی وہ سنبھل نہ پائی تھی کہ عبدالرحمان بن ابوبکر کی سرکردگی میں ایک ہزار کے تیسرے دستے نے شمال کی طرف سے ہلہ بول دیا۔ آدھ گھنٹے کے وقفے سے خالد نے اپنا ایک ہزاری دستہ لے کر بازنطینیوں کے مغرب سے دھاوا بول دیا۔ چاروں طرف سے گھرنے کی وجہ سے رومی مقابلہ نہ کر پائے۔ تھامس اور ہربیس کو خالد نے دوبدو مقابلوں میں خود قتل کیا۔ رومیوں کی تعداد مسلمان حملہ آوروں سے کئی گنا زیادہ تھی اس لیے ہزاروں رومی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے، بے شمار مسلمانوں کی قید میں آ گئے۔ مرج الدیباج کے معرکے میں خالد کا غنیم کو چہار اطراف سے گھیر کر مارنا وہ فوجی طریقہ تھا جسے تیرہویں صدی عیسوی میں منگول فوج نے اپنا principal maneuver بنا لیا۔

۱۷ شعبان ۱۳ھ (۱۵ اکتوبر ۶۳۴ء): ابوعبیدہ بن جراح نے کمانڈر ان چیف بننے کے بعد فوج کا ایک دستہ بیروت کے شمال میں واقع مقام ابوالقدس بھیجا جہاں کوئی سالانہ میلہ منعقد ہو رہا تھا۔ وہاں موجود بھاری بازنطینی عیسائی فوج نے اس چھوٹے سے دستے کو گھیر لیا۔ ابوعبیدہ نے فوراً خالد کو اس کی مدد کے لیے بھیجا۔ انھوں نے نہ صرف پھنسے ہوئے مسلمان سپاہیوں کو بچایا، بلکہ بے شمار مال غنیمت بھی حاصل کیا۔

[باقی]

پروفیسر خورشید عالم

عہد رسالت میں خواتین کا سیاسی کردار

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۳)

(گزشتہ سے پیوستہ)

غزوۂ خندق

خندق کھودنے میں چھ دن صرف ہوئے۔ محاصرہ مہینا بھر جاری رہا۔ ۲۵ روز تک اللہ کے رسول نے بنوقریظہ کا محاصرہ کیا۔ مسلمان مسلسل دو ماہ تک مورچوں میں بیٹھے رہے۔ اس اثناء میں خانگی اور معاشرتی، سب کام خواتین سرانجام دیتی رہیں۔ مجاہدین کے کھانے پینے کا بندوبست، اسے مورچوں تک پہنچانا اور عہد شکن یہودیوں سے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت، سب انھی کے ذمے تھی۔ محدثین اور سیرت نگاروں نے اس عرصے کے بہت سے ایمان افروز واقعات نقل کیے ہیں۔ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب آطام (پتھروں کا مکان) حسان میں بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک یہودی اس قلعہ نما مکان کے گرد چکر لگا رہا ہے تو انھوں نے حضرت حسان سے کہا کہ جاؤ اس یہودی کو قتل کر دو۔ وہ کہنے لگے: بخدا، آپ تو جانتی ہیں کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ حضرت صفیہ نے اپنے کمر کے گرد کپڑا باندھا، ایک چوبی ستون ہاتھ میں پکڑا، قلعہ سے نیچے اتر کر ستون سے ضرب لگا کر یہودی کو مار دیا۔ اس کے بعد وہ حسان سے کہنے لگیں: جاؤ، اس کا مال لوٹ لاؤ۔ مرد ہے مجھے شرم مانع ہے، وہ کہنے لگے: مجھے اس کی ضرورت نہیں، انھوں نے خود اس کا سامان چھینا اور اس کا سر کاٹ کر قلعے سے نیچے لڑھکا دیا تو اس کے ساتھی یہ سمجھتے

ہوئے بھاگ گئے کہ قلعے میں مرد موجود ہیں۔

اللہ کے رسول نے حضرت سعد بن معاذ کو مسجد نبوی میں اس خیمہ میں رکھا جو بنو اسلم کی رشیدہ نامی خاتون چلا رہی تھی۔ رشیدہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھی اور اس نے اپنے آپ کو نادار مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔ گویا اس کا کردار میدان جنگ تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ ضرورت مند مسلمانوں کی خدمت کے لیے کوشاں تھی۔

بنو نضیر کے محاصرے کے تقریباً پچیسویں روز حضرت سعد بن معاذ کی وفات ہوئی تو ان کی والدہ کبیشہ بنت رافع بن معاویہ الخزرجی نے درج ذیل الفاظ میں ان کا مرثیہ کہا:

ویل أم سعد سعدًا   صرامة وحدا
سؤددا و مجدا   وفارسًا معدًا
سد به مسدّا   یقدها ما قدًا

سعد کی ماں کا سعد پر افسوس جس نے متانت اور وقار اور شاہ سواری میں اپنا مقام بنایا اور ان صفات پر پورا اترا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول سب سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے: ''ہر نوحہ گر عورت مبالغے سے کام لیتی ہے، سوائے ام سعد کے، اس نے جو کہا درست کہا، جھوٹ نہیں بولا۔''

غزوۂ حدیبیہ

۶ھ میں ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۱۴۰۰ اصحابۂ کرام رضی اللہ علیہم تھے اور آپؐ کی بیوی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ آپ کو خبر ملی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے تو آپ نے درخت کے نیچے موت اور عدم فرار پر بیعت لی، جس میں خواتین بھی شامل تھیں۔ بیعت رضوان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ معاہدہ لکھا گیا تو آپؐ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو احرام کھولنے کا اور سر منڈانے کا حکم دیا۔ آپؐ نے یہ حکم تین بار دہرایا، مگر صحابۂ رضی اللہ عنہم تیار نہ ہوئے، کیونکہ معاہدے کی دفعات پر ان کے تحفظات تھے۔ آپؐ اندر داخل ہوئے اور حضرت ام سلمہ کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتایا، انھوں نے مشورہ دیا کہ آپ باہر نکل کر کسی سے بات کیے بغیر اپنا احرام کھول دیں، قربانی کر کے سر منڈ والیں۔ آپؐ نے ان کے مشورے پر عمل کیا تو سب صحابہ نے آپ کی تقلید کی۔ یہ مشورہ حضرت ام سلمہ کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ مسلمانوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ واپس جانے اور معاہدے پر عمل درآمد کرنے کا عزم کر لیا ہے، اور جانتی تھیں کہ اس عزم کے بعد کسی صحابی کو آپ

کی مخالفت کی جرأت نہ ہوگی۔ اس طرح اس خاتون کے مشورے نے مسلمانوں کو ہلاکت سے بچالیا۔

غزوۂ خیبر

حدیبیہ سے لوٹنے کے بعد ۷ھ میں مسلمانوں کا لشکر خیبر کی طرف روانہ ہوا۔ ابن سعد نے ''الطبقات الکبریٰ'' (۳۹۵/۸) میں حضرت ام سنان اسلمیہ سے روایت کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول، میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی، مشکیزے سیوں گی، مریضوں اور زخمیوں کا دوادارو کروں گی، کجاووں کی نگہداشت کروں گی۔ آپ نے فرمایا: بسم اللہ چلو، میں نے تیری قوم کی اور دوسری قوموں کی خواتین کو بھی اجازت دی ہے، چاہو تو اپنی قوم کے ساتھ نکلو چاہو تو ہمارے ساتھ۔ میں نے کہا: میں آپ کے ساتھ جاؤں گی، آپ نے فرمایا: ام سلمہ کے ساتھ ہو جاؤ۔ سیرت نگاروں نے بیس سے زیادہ خواتین کے نام گنوائے ہیں جنھوں نے غزوۂ خیبر میں شرکت کی۔

ابن اسحاق نے بنو غفار کی ایک خاتون کے بارے میں روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اس غزوہ میں شرکت کی اجازت دی۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نوعمر تھی، نبی پاک نے اپنے کجاوے کی کاٹھی (Saddle) کے پیچھے مجھے بٹھالیا۔ مجھے اچانک حیض آ گیا۔ یہ میرا پہلا حیض تھا تو حیا کی وجہ سے میں سکڑ کر بیٹھ گئی۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خون دیکھا تو فرمایا: تجھے کیا ہوا ہے، شاید تجھے حیض آ گیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، آپؐ نے فرمایا: اپنے آپ کو درست کرلو۔ پانی کا برتن لو، اس میں نمک ڈالو اور کاٹھی پر جو خون گرا ہے، اسے دھوڈالو، پھر واپس آ کر سواری پر سوار ہو جاؤ۔

عمرۃ القضیۃ

مسلمان غزوۂ حدیبیہ میں عمرہ نہیں کر سکے تھے۔ چنانچہ ۷ھ میں وہ شان وشوکت کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے نکلے۔ سیاسی طور پر اس عمرے کی خاصی اہمیت تھی، اس لیے اسے عمرۃ القصاص بھی کہا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول نے حکم دیا: جو بھی حدیبیہ کے عمرے میں شریک تھے، خواہ مرد ہوں یا خواتین، سب اس عمرے کے لیے نکلیں۔ چنانچہ وہ سب خواتین اس عمرے کے لیے نکلیں جن کا ذکر غزوۂ حدیبیہ میں ہو چکا ہے۔ اس عمرے میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی شریک تھیں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب لوگ قضائے عمرہ کے لیے نکلے تو ان کے پیچھے حضرت حمزہ کی بیٹی یہ پکارتے ہوئے نکلی: اے میرے چچازاد، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور حضرت فاطمہ

سے کہا: اپنی چچازاد کو پکڑلو۔

فتح مکہ

۸ھ میں جب لوگوں کو تیاری کا حکم دیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے جو تیاری میں مصروف تھیں۔ آپ نے پوچھا کہ اللہ کے رسول نے تمھیں تیاری کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، آپ نے فرمایا: کہاں کی تیاری ہے؟ انھوں نے کہا: معلوم نہیں، بعد میں آپ نے ان کو بتایا کہ ہم مکہ کی طرف جا رہے ہیں۔ سیرت نگاروں نے ایسی ۸ خواتین کے نام گنوائے ہیں جنھوں نے فتح مکہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں شرکت کی۔ ان کے علاوہ انھوں نے چھ ایسی خواتین کے نام گنوائے ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ بعض خواتین نے بعض مشرکین کو پناہ دی اور ان کی پناہ کو قبول کیا گیا۔ ام ہانی نے اپنے سسرال والوں کو پناہ دی۔ ام حکیم بنت حارث نے اپنے شوہر عکرمہ کو پناہ دی۔ ام سلمہ نے ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب اور اپنے بھائی عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ کو پناہ دی اور ان کی سفارش پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کیا۔

غزوۂ حنین

فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن نے ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کیا اور لشکر کے پیچھے سب سپاہیوں کے بال بچے موجود تھے۔ مسلمان خواتین نے حسب معمول اس غزوے میں شرکت کی۔ بعض خواتین ہتھیار بند تھیں، حضرت ام عمارہ کے ہاتھ میں تلوار تھی اور حضرت ام سلیم کے پاس خنجر جو انھوں نے اپنی کمر میں باندھ رکھا تھا۔ حضرت ابوطلحہ نے دیکھا تو اللہ کے رسول سے کہا: ام سلیم کے پاس خنجر ہے، آپؐ نے پوچھا: ام سلیم، یہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اگر کسی مشرک نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو اس سے اس کا پیٹ چاک کروں گی۔ خواتین کی ہیرو حضرت ام عمارہ بھاگنے والے انصار کو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں، بھاگ کیوں رہے ہو؟ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے ہوازن کے ایک آدمی جو ہاتھ میں جھنڈا پکڑے، خاکستری رنگ لمبے تڑنگے اونٹ پر سوار ہو کر مسلمانوں کے پیچھے تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ کا راستہ روکا۔ میں نے اونٹ کی کونچ کاٹ دی۔ وہ پیٹھ کے بل نیچے گرا تو میں نے اس پر سخت حملہ کر کے اسے ٹھکانے لگا دیا اور اس کی تلوار چھین لی، اونٹ الٹا پڑا ابلبلا رہا تھا۔ خواتین کی اس ہیرو نے بیعت عقبہ ثانیہ، غزوۂ احد، غزوۂ حدیبیہ، غزوۂ خیبر، عمرۃ القضیۃ، فتح مکہ، غزوۂ حنین اور جنگ یمامہ میں شرکت کر کے اپنی بہادری کا لوہا منوایا۔

ان کے علاوہ حضرت صفیہ بنت عبد المطلب، حضرت ام ایمن، حضرت اسماء بنت عمیس، حضرت ام حارث اور حضرت ام سلیط نے غزوۂ حنین میں شرکت کی۔ جب مسلمان بھاگ رہے تھے، یہ سب مشرکین کے خلاف لڑ رہی تھیں۔ جب مشرکین کو شکست ہوئی تو ایک عورت نے اونچی آواز سے کہا: اللہ کے گھوڑے لات کے گھوڑوں پر غالب آ گئے اور اللہ کے گھوڑے ثابت قدمی کے زیادہ حق دار ہیں۔

غزوۂ طائف

شوال ۸ھ میں ہوا۔ امہات المومنین ام سلمہ اور زینب رضی اللہ عنہما آپ کے ساتھ تھیں۔ یہ طائف کا محاصرہ اٹھارہ روز تک جاری رہا۔ دیگر خواتین کے ساتھ عثمان بن سفوان کی بیوی خولہ بنت حکیم بھی طائف کے محاصرے میں شریک تھی۔ اس نے اللہ کے رسول سے کہا کہ اگر طائف فتح ہو گیا تو آپ مجھے بادیہ بنت غیلان کے زیورات عطا کریں گے۔ آپ نے فرمایا: اگر ہمیں بنو ثقیف پر حملہ کرنے کی اجازت نہ ملی پھر بھی تم یہ مطالبہ کرو گی؟ خولہ نے یہ بات حضرت عمر کو بتائی۔ انھوں نے نبی پاک سے پوچھا: یہ خولہ کیا بات کہہ رہی ہے؟ کیا آپ کو اس کی اجازت نہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، حضرت عمر نے کہا کہ کیا میں لوگوں میں کوچ کا اعلان کر دوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اس روایت سے پتا چلتا ہے کہ خولہ نے ثقیف کے بارے میں اجازت نہ ملنے کا مطلب سمجھ لیا تھا اور ان کے بتانے پر حضرت عمر نے کوچ کا اعلان کیا۔

غزوۂ تبوک

۹ھ میں ہوا۔ سخت گرمی تھی۔ قحط کا زمانہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال دار صحابہ کو نیکی کی ترغیب دی۔ خواتین جہاد بالمال کے لیے آگے بڑھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو کپڑا بچھا ہوا تھا، بخاری اور مسلم کی روایت کے مطابق، خواتین اپنے کنگن، بازو بند، پازیب، بالیاں اور انگوٹھیاں اس میں ڈالتی جاتی تھیں اور ان کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق جہاد کا اجر ملا۔ آپ کا قول ہے: 'من جهز غازيًا في سبيل الله فقد غـزا*' (جس نے اللہ کی راہ میں غازی کو تیار کیا، وہ ایسے ہے جیسے اس نے خود غزوہ میں شرکت کی)۔ قرآن کریم میں جہاد بالمال کا جہاد بالنفس سے پہلے ذکر ہے۔

---

* بخاری، رقم ۲۶۸۸۔

بخاری اور ابواب جہاد

امام بخاری رحمہ اللہ نے جہاد پر درج ذیل باب باندھے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے جہاد میں خواتین کے کردار کا واضح ثبوت ملتا ہے:

۱۔ مردوں اور عورتوں کے لیے جہاد اور شہادت کے بارے میں دعا۔

۲۔ عورتوں کا جہاد۔

۳۔ عورتوں کا سمندر میں جہاد۔

۴۔ مردوں کا دوسری بیویوں کو چھوڑ کر ایک کو غزوہ میں لے جانا۔

۵۔ مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں کا قتال۔

۶۔ غزوہ میں عورتوں کا مجاہدین کے پاس مشکیزے اٹھا کر لے جانا۔

۷۔ غزوہ میں عورتوں کا زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا۔

۸۔ عورتوں کا زخمیوں کو اٹھا کر لے جانا۔

۹۔ غزوہ میں ام سلیط کا کردار۔

۱۰۔ اس کی فضیلت جو اللہ کے راستے میں گر کر مر جائے۔ اس کا شمار شہدا میں ہوگا۔ ام حرام بنت سلمان کا تذکرہ۔

۱۱۔ عورت کا جہاد کے لیے سمندری سفر۔

۱۲۔ اہل روم سے جہاد کے بارے میں پیشین گوئی۔ ام حرام کی روایت سمندری جہاد میں امت کے لیے جنت کی بشارت۔ ام حرام کا سوال کہ کیا میں ان میں شامل ہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ہاں۔

خلاصۂ بحث

جہاد میں خواتین کی شرکت سارے معاشرے کی حرکت کے ساتھ وابستہ تھی اور وہ انسانی ڈھانچے کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ خواتین کی شرکت واجب نہ تھی، یہ عورت کو اختیار تھا کہ وہ اپنی قدرت کے مطابق اس میں شریک ہو۔ اس کے لیے کسی خاص عمر اور خاص خاندانی حالات کی تخصیص نہ تھی، چھوٹی بڑی عمر کی، حاملہ اور غیر حاملہ ہر عورت اپنی استطاعت کے مطابق شریک ہو سکتی تھی۔

جہاد عام طور پر فرض کفایہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان محفوظ رہ کر اپنی دینی اور دنیوی مصلحتوں کو سرانجام

دے سکیں۔ ہر مرد اور عورت اپنی ترجیحات اور قدرت کو دیکھ کر فیصلہ کرے گا کہ یہ اس کے لیے فرض کفایہ ہے یا نہیں۔ عورت کو وہ کردار ادا کرنا پڑے گا جو معاشرہ اس پر عائد کرتا ہے۔ انھوں نے مجاہدین کے کھانے کی تیاری، معرکے کے دوران پانی اور ستو پلانے، ان کو تیر اور ہتھیار فراہم کرنے، ان کے پچھواڑے کی حفاظت کرنے، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے، شہدا کے لاشوں کو اٹھانے اور دفن کرنے اور بوقت ضرورت شمشیر زنی اور تیر اندازی کے ہر کام میں حصہ لیا۔

عصر حاضر میں عورت پر سب سے بڑا ظلم یہ ہوا ہے کہ ان کو معاشرے کے بلند مقاصد سے الگ کر دیا گیا ہے۔ نتیجۃً وہ لایعنی اور فضول کاموں میں مصروف ہوگئی ہیں۔ ہم نے مشہور کر دیا ہے کہ عورتیں دنیوی منافع کی طرف راغب ہوتی ہیں، جبکہ تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کوئی عورت مال غنیمت پر جھپٹی ہو۔

عورت جہاد میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے جہاد میں شریک ہوئی اور ان سے شہادت، حتیٰ کہ سمندری جہاد میں شہادت کے لیے درخواست کرتی ہے۔

جامعہ ازہر کے شیخ شلتوت خواتین کے جہاد کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''یہ وہ وسیع میدان ہے جس کے لیے اسلام نے مرد اور عورت کی شراکت کا فیصلہ کیا ہے۔ اسلام نے عورت کو اس کی انسانی صلاحیتوں کے بارے میں باخبر کیا ہے اور اس کی سوچ اور ضمیر کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور اس نے بھی اپنا فرض خوب نبھایا ہے۔ اس نے دنیا کی کسی چیز کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا اس کی نظر صرف جنت پر ٹھہرتی ہے اور صرف یہی اس کی امیدوں کی آماج گاہ ہے۔''

عہد نبوت میں فتنۂ ارتداد اور خواتین کا کردار

(۴)

جس دین کے دفاع کے لیے خواتین نے سختیاں جھیلیں، گھر بار چھوڑا اور غزوات میں شرکت کی، فتنۂ ارتداد اس دین کے لیے ایک حقیقی خطرہ تھا۔ ایک طرف تو خاتون نے اس فتنہ کی حمایت میں نہ صرف مرتدین کے لشکر کی قیادت کی، بلکہ نبوت کا دعویٰ بھی داغ دیا، جبکہ دوسری طرف خاتون نے جھوٹے نبی اسود عنسی کے خلاف بڑا فعال کردار ادا کیا۔

عہد نبوت کے آخر میں اسود عنسی اور طلیحہ اسدی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور آپ کی زندگی میں اسود عنسی کے جھوٹے دعویٰ کا خاتمہ ہوا۔

اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور یمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمال کو لکھ بھیجا: ہمارے خلاف سرکشی کرنے والو، جس زمین پر تم نے قبضہ جمایا ہے، وہ ہمیں واپس کر دو اور جو مال تم نے جمع کیا ہے، اسے ہمارے لیے چھوڑ دو، کیونکہ ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں، پھر وہ نجران کی طرف نکلا اور دس راتوں کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس نے صنعاء کا رخ کیا تو یمن میں کسریٰ کے عامل شہر بن باذام نے اس کا مقابلہ کیا۔ اسود نے اس کے لشکر کو شکست دے کر صنعاء پر قبضہ کر لیا۔ (جب نبی کریم نے کسریٰ کے قتل ہونے کی خبر شہر بن باذام کو دی تھی تو وہ متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا)۔ اسود نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ اس کا نام آذار تھا۔

امام طبری نے اپنی کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' (۲۳۱/۳۰) میں روایت کی ہے کہ جشیش دیلمی آذار کے پاس گیا اور اس سے کہا: اے چچازاد، تو جانتی ہے کہ اس آدمی نے تیری قوم کو ذلیل وخوار کیا ہے، خواتین کو رسوا کیا ہے، کیا تو اس کے خلاف ہماری مدد کر سکتی ہے؟ اس نے کہا: کس قسم کی مدد؟ اس نے کہا: اسے نکالنے کی، آذار نے جواب دیا: یا اسے قتل کرنے کی؟ اس نے کہا: ہاں، اسے قتل کرنے کی۔ آذار نے حامی بھر لی۔

البدایۃ والنہایہ (۳۱۲/۶) میں ہے کہ وہ عورت نیکوکار تھی اور اللہ اور اس کے رسول پر پختہ ایمان رکھتی تھی۔ اس نے کہا: بخدا، میرے نزدیک اس شخص سے بڑھ کر کوئی مکروہ نہیں۔ وہ نہ اللہ کے حق کا پاس کرتا ہے، نہ حرام سے رکتا ہے۔ جب تم اسے ٹھکانے لگانے کا عزم کر لو تو مجھے بتانا، میں تمھیں طریقہ بتاؤں گی۔ اس عورت نے اپنی قوم کی بے عزتی اور اپنے شوہر کے قتل کا بالکل ذکر نہیں کیا، ذکر کیا تو اللہ کے حقوق اور اس کی ممنوعہ چیزوں کا۔ آذار نے جشیش کو بتایا: کہ وہ بڑا محتاط ہے۔ میرے گھر کے سوا ہر وقت پہرے دار اسے گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ فلاں فلاں راستے میں پہرے دار نہیں ہوتے تم اسی راستے سے گھر میں نقب لگانا، تمھیں وہاں چراغ بھی ملے گا اور ہتھیار بھی۔

جب جشیش آذار کو اپنے ارادے سے باخبر کرنے کے بعد گھر سے نکل رہا تھا تو اچانک اس کی ملاقات اسود سے ہو گئی، وہ پوچھنے لگا: یہاں کیوں آئے تھے؟ اور ساتھ ساتھ اس کے سر پر ضربیں بھی لگانے لگا، یہاں تک کہ وہ نیچے گر گیا، اندر سے آذار کے چیخنے کی آواز آئی۔ میرا چچازاد ہے، مجھ سے ملنے آیا تھا، تو نے میرے حق میں کوتاہی کی ہے۔ تو اسود نے کہا: خاموش ہو جاؤ، میں نے تیری خاطر اسے معاف کر دیا۔ جشیش نے سارا واقعہ اپنے ساتھیوں کو کہہ سنایا۔ اتنے میں آذار کا قاصد یہ پیغام لے کر پہنچ گیا کہ اپنے ارادے سے پیچھے نہ ہٹنا، میں نے اسے مطمئن کر دیا ہے۔

جشیش نے اپنی جگہ فیروز دیلمی کو بھیجا، کیونکہ اسے تو اسود پہچان گیا تھا۔ فیروز نے آذار کے ساتھ مل کر لکڑی کے ستون میں نقب لگائی اور اندر داخل ہو گئے اور جہاں نقب لگائی، وہاں اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ اسود زور زور سے

خراٹے لے رہا تھا۔ فیروز تلوار گھر بھول گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ تلوار لینے گیا تو اسے اور آذار، دونوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسود کے سر کو دبوچا اور اسے قتل کر دیا۔ وہ بیل کی طرح ڈکارنے لگا۔ آواز سن کر پہرے دار دروازے پر آئے تو آذار نے اپنے آپ پر قابو پا کر کہا: کوئی بات نہیں، نبی پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ اس خاتون نے فیروز کے ساتھ مل کر وہ کام کیا جو پورا لشکر نہ کر پایا تھا۔ اگر وہ خاتون صاحب فہم و فراست نہ ہوتی تو اسود کے قتل کا خواب پورا نہ ہوتا۔ وہ جرأت مند مومن خاتون تھی جسے اللہ کی تائید حاصل تھی۔

اسود کے قتل کے بعد صنعاء دشمن کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔ یمن میں دین اسلام راسخ ہو گیا۔ صحابۂ کرام لوٹ آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خبر ملی تو آپ نے فرمایا: بے شک، اللہ نے اسود عنسی کو قتل کر دیا ہے تمھارے بھائی بہنوں میں سے ایک کے ذریعے سے اور ان لوگوں کے ذریعے سے جو صدق دل سے اسلام لائے۔ اس طرح آپ نے فیروز اور آذار کی تعریف فرمائی۔

حضرت عائشہ کا سیاسی کردار

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دور عثمان کے فتنے کے بارے میں دوسری امہات المومنین اور صحابی خواتین کے موقف پر نظر ڈالی جائے۔ اس سلسلہ میں امام طبری نے (تاریخ الامم والملوک ۳۴۹/۴ میں) سب سے پہلی روایت سیف بن عمر سے بیان کی ہے کہ جب بصرہ، کوفہ اور مصر کی جماعتیں اکٹھی ہو گئیں اور مدینہ سے ابھی تین دن کے فاصلے پر تھیں تو انھوں نے دو آدمیوں کو خیر خبر لانے کے لیے آگے آگے بھیجا۔ انھوں نے ازواج مطہرات، علی، طلحہ اور دوسرے صحابہ سے ملاقات کا ارادہ کیا اور کہا کہ ہم تو اہل بیت کی اقتدا کرتے ہیں بعض عاملوں کے بارے میں خلیفہ سے شکایت کرنے آئے ہیں اور ان سے ملنے کی اجازت طلب کرتے ہیں، ان سب نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا: ''یہ مشتبہ معاملہ ہے، اس کا برا نتیجہ نکلنے والا ہے''۔ یہ سب امہات المومنین کا مشترکہ موقف تھا۔

حضرت ام حبیبہ کا موقف

سب سے اہم ہے، کیونکہ وہ ان واقعات میں خواتین کے سیاسی کردار پر دلالت کرتا ہے۔ تاریخ طبری (۴: ۳۸۵) میں ہے کہ جب حضرت عثمان کا محاصرہ کر کے ان کا پانی بند کر دیا گیا تو انھوں نے (اپنے پڑوسی) عمرو بن حزم

انصاری کے بیٹے کو حضرت علی کی طرف بھیجا کہ ان لوگوں نے ہمارا پانی بند کر دیا ہے۔ ہو سکے تو کچھ پانی بھجوا دو۔ انھوں نے بھجوا دیا۔ یہ پیغام انھوں نے سیدہ عائشہ اور دوسری امہات المومنین کی طرف بھی بھجوایا۔ سب سے پہلے حضرت علی اور ام حبیبہ نے حضرت عثمان کی مدد کی۔ ام حبیبہ نے تو اپنی جان تک کی پروا نہ کی۔ حضرت ام حبیبہ خچر پر سوار ہو کر آئیں، کجاوے میں پانی کا برتن تھا۔ باغیوں نے خچر کے منہ پر ضرب لگائی۔ انھوں نے کہا کہ اس آدمی کے پاس بنو امیہ کی وصیتیں ہیں، مجھے ڈر ہے کہ یتیموں اور بیواؤں کا مال ضائع نہ ہو جائے۔ میں اس بارے میں پوچھنے جا رہی ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ یہ جھوٹ بولتی ہیں۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر خچر کی رسی کاٹ دی۔ خچر بدکا اور کجاوہ ایک طرف جھک گیا۔ لوگ کجاوے سے چپک گئے اور اسے پکڑ لیا۔ قریب تھا کہ ام المومنین قتل ہو جاتیں، لیکن لوگ ان کو گھر کی طرف لے گئے۔

ابن شبّہ نے ''تاریخ مدینہ'' (۲/ ۲۶۲) میں روایت کی ہے کہ جب سپاہیوں نے حضرت عثمان کی میت کو دفن کرنے سے روکنے کی کوشش کی تو ام حبیبہ نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا: اگر تم میرے اور اس شخص کی تدفین کے درمیان حائل ہوئے تو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ستر کھول دوں گی، تو وہ لوگ آپ کے راستے سے ہٹ گئے۔

حضرت صفیہ کا موقف

ابن اثیر نے ''اسد الغابہ'' (۴/ ۳۷۴) میں کنانہ بن عدی سے روایت کی ہے کہ جب ام المومنین حضرت صفیہ حضرت عثمان کی مدافعت کے لیے نکلیں تو میں نے ان کے خچر کی مہار پکڑی ہوئی تھی۔ اشتر نخعی آپ کے سامنے آیا اور خچر کے منہ پر ضرب لگائی، یہاں تک کہ آپ ایک طرف جھک گئیں اور فرمانے لگیں: مجھے چھوڑ دو، مجھے رسوا نہ کرو۔ امام ذہبی ''سیر اعلام النبلاء'' (۲/ ۲۲۷) میں کہتے ہیں کہ حضرت صفیہ نے اپنے گھر سے لے کر حضرت عثمان کے گھر تک لکڑی کا تختہ ڈال دیا جس کے ذریعے سے وہ کھانا اور پانی حضرت عثمان تک پہنچاتی تھیں۔

جو کچھ ام المومنین ام حبیبہ کے ساتھ ہوا تھا، اس سے لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ حضرت عائشہ مدینے سے نکلیں تو مروان بن حکم نے کہا: ام المومنین، آپ کا یہاں قیام اس شخص کے حق میں بہتر ہو گا۔ آپ نے جواب دیا کہ تم چاہتے ہو کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک ہو جو ام حبیبہ کے ساتھ ہوا ہے اور میری حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہو۔ بخدا مجھے کوئی عار نہیں دلائے گا۔ خدا جانے ان لوگوں کا رویہ کہاں تک پہنچ جائے۔ امہات المومنین نے فتنے سے گریز کرتے ہوئے

حج کی تیاری شروع کر دی۔ وہ اس بات کی کوشش کر رہی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح حضرت عثمان کو ان فتنہ پردازوں سے نجات دلا دیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ نے محمد بن ابی بکر کو اپنے ساتھ حج پر لے جانے کی کوشش کی، مگر اس نے انکار کر دیا۔ کاتب وحی حنظلہ کو یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ محمد بن ابی بکر حضرت عائشہ کے ساتھ جانے سے انکار کر رہا ہے اور باغیوں کا ساتھ دینے پر اصرار کر رہا ہے۔ وہ کہنے لگے: اے محمد، تمھیں ام المومنین دعوت دے رہی ہیں تو ان کا کہا نہیں مان رہا اور عرب کے بھیڑیے تمھیں ایک ناروا بات کی دعوت دے رہے ہیں اور تو ان کا کہا مان رہا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: بخدا، اگر میں ان لوگوں کو روکنے کی طاقت رکھتی تو ان کو ضرور روکتی۔

حضرت اسماءؓ بنت عمیس نے اپنے دونوں لڑکوں محمد بن ابی بکر اور محمد بن جعفر کو بلا کر کہا: اللہ سے ڈرو آج ایسا کام نہ کرو جو کل تمھارے لیے حسرت کا باعث بنے۔ وہ دونوں غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ عثمان نے جو ہمارے ساتھ کیا ہے، ہم اسے بھلا نہیں سکتے۔ وہ کہنے لگیں: کیا کیا ہے عثمان نے تمھارے ساتھ؟ اللہ کی اطاعت ہی کو تم پر واجب کیا ہے۔

ام سلیم نے جب حضرت عثمان کے قتل کی خبر سنی تو فرمایا:

أما أنه لم يحلبوا بعده إلا دمًا. ''یہ لوگ عثمان کے بعد دودھ کی جگہ صرف خون دوہیں گے۔''

اشتر کی بیوی حضرت علی کے پاس آ کر کہنے لگیں: امیر المومنین، میں نے اللہ کے دشمن سے ایک بات سنی ہے جو میں سینے میں نہیں رکھ سکتی۔ وہ کہتا ہے کہ کل ہم نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا ہے جو اللہ کی مخلوق میں سب سے بہتر تھا اور ہم نے ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو اللہ کی مخلوق میں سب سے بدتر ہے۔

عام مسلمان خواتین کا بھی یہی موقف تھا۔ یہ موقف اعتدال پر مبنی ہے اور اس میں تعصب کا شائبہ تک نہیں، لیکن سب سے نمایاں موقف جس پر تاریخ نے روشنی ڈالی ہے، ام المومنین سیدہ عائشہ کا موقف تھا۔

حضرت عائشہ کے نزدیک حضرت عثمان کا مرتبہ ومقام

حضرت عثمان کے فضائل ومناقب کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی مرویات سے پتا چلتا ہے کہ ان کے یہاں خلیفۂ سوم کا مرتبہ ومقام کیا تھا۔

صحیح مسلم (کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل عثمان) میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں لیٹے ہوئے تھے اور آپ کی رانیں یا پنڈلیاں ننگی تھیں ..... جب حضرت عثمان اندر داخل ہوئے تو آپؐ اپنے کپڑے درست کر کے بیٹھ گئے میں نے پوچھا کہ آپ نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے آنے پر ایسا نہیں کیا؟ تو آپ نے فرمایا ''کیا میں اس سے شرم نہ کھاؤں جس سے فرشتے بھی شرم کھاتے ہیں۔''

کنز العمال، رقم ۳۲۸۴۱ اور ابن کثیر نے البدایۃ والنہایہ (۲۱۲/۷) میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: ''اے اللہ میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔''

کنز العمال، رقم ۳۲۷۹۱ اور شوکانی نے ''درالسحابۃ فی مناقب القرابۃ والصحابہ'' (۱۸۲) میں حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول نے کہا: ''بے شک، اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی عثمانؓ سے کر دوں۔''

امام احمد نے ''مسند'' مسند عائشہ میں روایت کی ہے کہ فاطمہ بنت عبدالرحمٰن کی ماں نے حضرت عائشہ کے پاس ان کے چچا کو بھیجا کہ ان کو میرا سلام کہنا اور عثمان کے بارے میں پوچھنا، کیونکہ لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا: جو ان پر لعنت بھیجتا ہے، اس پر خدا کی لعنت ہو۔ بخدا، عثمان اللہ کے رسول کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور اللہ کے رسول کی پیٹھ میری طرف تھی اور وہ کہہ رہے تھے، اے عثیم (پیار سے عثمان کو عثیم کہا) لکھو۔ حضرت عائشہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ مقام اس کو عطا کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو عزیز ہو۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے لقمان بن بشیر کے واسطہ سے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عثمان، اللہ تمھیں خلافت کی قمیص پہنائے گا، اگر لوگ چاہیں کہ آپ اسے اتار دیں تو مت اتارنا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ منافقوں کی خواہش پر اسے اس وقت تک نہ اتارنا، جب تک تمھاری ملاقات مجھ سے نہ ہو جائے۔ ابن ماجہ (۴۱/۱ میں) نے روایت کی ہے کہ حضرت عثمان نے قتل ہونے سے پہلے کہا: ''اللہ کے رسول نے مجھ سے عہد لیا ہے اور میں ان کی طرف جا رہا ہوں۔''

جس عائشہ سے یہ احادیث مروی ہیں، وہ حضرت عثمان کے خلاف معاندانہ موقف کیسے اختیار کر سکتی ہیں؟

حضرت عثمان کے قتل پر حضرت عائشہ کا ردعمل

جب لوگ مدینے سے بھاگ کر مکہ میں حضرت عائشہ کے پاس پہنچے تو انھوں نے حالات معلوم کیے۔ بتانے والوں نے بتایا کہ حضرت عثمان قتل ہو گئے ہیں اور کوئی امیر بننے کے لیے تیار نہیں، تو انھوں نے فرمایا: وہ چالاک

ہیں، کیونکہ اصلاح کے نام پر تمھارے درمیان جو لعنت ملامت ہو رہی تھی، اس کا انجام یہی ہونا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ کہے بغیر وہ مکہ لوٹ گئیں۔ مسجد حرام کے دروازے کے پاس اتر کر حجر اسود کا قصد کیا اور اس میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ لوگ آپ کے اردگرد جمع ہو گئے تو انھوں نے فرمایا: اے لوگو، مختلف شہروں اور دریاؤں کے بلوائی اور اہل مدینہ کے غلام اکٹھے ہوئے۔ انھوں نے آج کے مقتول اور کل کے عقل مند پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ انھوں نے نوعمر لڑکوں کو استعمال کیا۔ اس سے پہلے بھی وہ انھیں استعمال کر چکے تھے۔ قابل حفاظت مقامات نے ان کو حفاظت مہیا کی۔ یہ باتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں، ان سے کیا اصلاح ہو سکتی تھی۔ عثمان ان کی بات مان کر اصلاح کی غرض سے بعض باتوں سے رکے رہے۔ جب بلوائیوں کے پاس کوئی حجت اور کوئی عذر نہ رہا تو وہ بے چین ہو کر سرکشی پر اتر آئے۔ ان کے قول و فعل میں مطابقت نہ رہی۔ انھوں نے حرام خون بہایا۔ حرم نبوی اور حرمت والے مہینے کی بے حرمتی کی اور حرام طریقے سے مال لوٹا۔ بخدا، عثمان کی ایک انگلی سطح زمین پر پھیلے ہوئے ان جیسے لوگوں سے بہتر ہے۔ پس ان کے خلاف جمع ہو کر ان سے نجات حاصل کرو تاکہ دوسرے لوگوں کو ان سے عبرت حاصل ہو اور ان کے بعد آنے والے منتشر ہو جائیں۔ بخدا، اگر انھوں نے کسی قصور کی وجہ سے اس پر زیادتی کی ہے تو وہ اس قصور سے اس طرح صاف ہو گئے ہیں، جس طرح سونا کھوٹ سے صاف ہوتا ہے اور کپڑا میل کچیل سے، کیونکہ انھوں نے انھیں ایسے نچوڑا ہے، جیسے کپڑا پانی میں نچوڑا جاتا ہے۔ (تاریخ الامم والموک ۴/۴۴۸-۴۴۹)۔

طبری کی اس روایت سے پتا چلتا ہے کہ وہ معاملات پر کس قدر دقت نظر سے غور کرتی تھیں۔ قتل کی خبر سننے کے بعد فوری طور پر ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے: ''وہ چالاک لوگ ہیں''، یعنی اگر یہ سوچا سمجھا منصوبہ نہ ہوتا تو یہ حادثہ رونما نہ ہوتا۔ اور یہ کہ بعض صحابہ بلوائیوں سے خبریں سن کر ان پر یقین کرتے تھے اور حضرت عثمان پر بھری مجلسوں میں جو نکتہ چینی کرتے تھے، اس کا انجام تو یہی ہونا تھا۔ یہ الفاظ ان کی سمجھ بوجھ اور دانائی پر دلالت کرتے ہیں۔ جس طریقے سے بلوائی ابن سبا کی انگیخت پر علی الاعلان خلیفۂ رسول پر لعنت ملامت کرتے تھے، اس کی مثال آج تک تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔

قتل عثمان پر حضرت عائشہ کا ردعمل وہی تھا جو سب صحابہ کا تھا۔ قاتلین عثمان کے بارے میں سب کے جذبات ایک جیسے تھے۔ روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ سمجھتی تھیں کہ حضرت عثمان نے بلوائیوں کی اصلاح میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، یہاں تک کہ ان کے پاس کوئی حجت اور کوئی عذر باقی نہ رہا۔ حضرت عثمان ان کے نزدیک بے گناہ تھے اور ان کی ایک انگلی روئے زمین پر ان جیسے بسنے والوں سے بہتر تھی۔

اس لیے انھوں نے حضرت عثمان کی شہادت کا انتقام لینے کے معاملہ سے لحہ بھر بھی توقف نہ کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان محققین کی راے درست نہیں جو سمجھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ، طلحہؓ، اور زبیرؓ اور دوسرے صحابہ حضرت عثمان کے بارے میں باتیں بناتے تھے، وہ ان کا دفاع نہ کر سکے اور وہ قتل ہو گئے تو ان کو اپنی کوتاہی پر ندامت ہوئی۔

مخالف روایات اور ان کا تجزیہ

''تاریخ طبری'' میں بعض ایسی روایات ہیں جو حضرت عثمان اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے درمیان تلخ تعلقات پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ روایات عام طور پر ایسی روایات ہیں جو امام طبری نے واقعات کو بیان کرنے کے بعد روایت کی ہیں۔ امام صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مستند راویوں کی روایات کو غیر مستند راویوں کی روایات سے پہلے نقل کرتے ہیں۔

پہلی روایت ''تاریخ طبری'' میں یوں بیان ہوئی ہے:

''مجھے علی بن احمد بن الحسن العجلی نے لکھا کہ حسین بن نصر عطار نے کہا کہ مجھے سیف بن عمر نے حدیث سنائی کہ سیدہ عائشہ جب مکہ سے لوٹتے ہوئے مقام سرف تک پہنچیں تو ان کو عبد بن ام کلاب ملا۔ حضرت عائشہ نے اس سے پوچھا: حالات کیا ہیں؟ اس نے کہا: انھوں نے عثمان کو قتل کر دیا اور آٹھ روز تک ٹھیرے رہے، انھوں نے پوچھا: اس کے بعد انھوں نے کیا کیا؟ اس نے کہا: اہل مدینہ نے مدینہ پر قبضہ کر لیا اور معاملات بہتر طریقے سے چل پڑے۔ انھوں نے مل کر حضرت علی کو خلیفہ بنالیا۔ حضرت عائشہ کہنے لگیں: مجھے واپس لے چلو۔ مجھے واپس لے چلو۔ بخدا، آسمان زمین پر الٹ پڑے اگر خلافت تمھارے ساتھی کو ملی ہے۔ بس وہ یہ کہتی ہوئیں مکہ لوٹ گئیں۔ بخدا، عثمان مظلوم قتل ہوا۔ بخدا، میں اس کے خون کے بدلے کا مطالبہ کروں گی۔ ابن ام کلاب نے ان سے کہا: وہ کیوں؟ بخدا، آپ نے سب سے پہلے ان کے خلاف ترغیب دلائی۔ آپ کہا کرتی تھیں اس بے وقوف بوڑھے کو قتل کر دو، اس نے کفر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: انھوں نے اسے توبہ کی ترغیب دی، پھر قتل کیا۔ میں نے بھی کہا اور انھوں نے بھی کہا، لیکن میرا بعد والا قول پہلے قول سے بہتر ہے۔ تو ابن ام کلاب نے ان سے کہا:

فمنك البداء ومنك الغير ومنك الرياح ومنك المطر

وأنت أمرت بقتل الامام وقلت لنا إنه قد كفر

فهبنا أطعناك فی قتله وقاتله عندنا من أمر

''آپ ہی نے آغاز کیا اور خون بہا بھی آپ مانگ رہی ہیں۔ ہوائیں بھی آپ کی جانب سے آئی ہیں اور بارش بھی۔ آپ نے امام کو قتل کرنے کا حکم دیا اور آپ ہی نے ہم سے کہا کہ تحقیق اس نے کفر کیا ہے۔ فرض کرو کہ اس کے قتل کے لیے ہم نے آپ کا کہا مانا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا قاتل وہی ہے جس نے حکم دیا ہے۔''

پھر حضرت عائشہ مکہ لوٹ گئیں۔ مسجد کے دروازے پر آپ نے نزول کیا۔ حجر اسود کی طرف گئیں۔ اپنا چہرہ اس میں چھپا لیا۔ لوگ آپ کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا عثمان مظلوم قتل ہوئے ہیں بخدا میں ان کے خون کے بدلہ کا مطالبہ کروں گی۔''

یہ روایت ''تاریخ الامم والملوک'' (۴۵۹/۴) اور الامامۃ والسیاسہ (جو ابن قتیبہ کی طرف منسوب ہے، ۵۱/۱) میں بیان ہوئی ہے۔

روایت کی سند کا تجزیہ

طبری نے یہ روایت دو واسطوں سے روایت کی ہے۔ نصر بن مزاحم عطار کے سوا کسی راوی کے حال کا پتا نہیں چلتا۔ نصر بن مزاحم عطار اسماء الرجال کی کتابوں میں مجروح ہے۔ محدثین نے اسے رافضی، شیعہ، منکر اور متروک کہا ہے۔ حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' (۲۰۴/۶) میں لکھا ہے کہ ابوخیثمہ کا قول ہے کہ وہ جھوٹا ہے، دارقطنی کا قول ہے: وہ ضعیف ہے۔ عجلی کا قول ہے: وہ غلو کرنے والا رافضی اور غیر ثقہ ہے۔ خلیلی کا قول ہے: حفاظ نے اسے بہت ہی ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ذہبی کی ''میزان الاعتدال'' (۲۴/۷) اور ''المغنی فی الضعفاء'' (۶۹۶/۲) کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس واسطے میں سیف بن عمر بھی مذکور ہے جس کی روایت کو طبری نے اس روایت سے پہلے بیان کیا ہے اور اس بحث کے آغاز میں وہ پیش کی جا چکی ہے۔ ان دونوں روایات میں اس بارے میں تضاد ہے کہ حضرت عائشہ نے لوگوں کو فساد پر ابھارا۔ پھر حضرت علی کی خلافت کے بارے میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔

دوسرے واسطے میں عمر بن سعد ہے جو اس لشکر کا سردار تھا جس نے امام حسین کو قتل کیا۔ محدثین نے اس پر حدیث وضع کرنے کا الزام لگایا ہے اور کہا ہے کہ وہ متروک ہے۔ اس کے بارے میں ذہبی کی ''سیر اعلام النبلاء'' (۳۴۹/۴)، بخاری کی ''التاریخ الکبیر'' (۱۵۸/۶) اور ابن حجر کی ''تہذیب التہذیب'' (۸۳/۳) کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک اور راوی اسد بن عبداللہ، ابن حجر (تقریب التہذیب (۸۸۱)) کی رائے میں حدیث میں نرم ہے اور بخاری کی رائے

میں اس کی حدیث کی متابعت نہیں ہوتی۔ اس کی وفات ۲۰ھ میں ہوئی، وہ ۵۳ھ میں ہونے والے واقعہ کی روایت کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ یہ روایت سند کے اعتبار سے غیر مقبول ہے۔

متن روایت کا تجزیہ

پہلی روایت (جسے سیف بن عمر نے اپنے شیوخ سے روایت کیا ہے) اور روایت زیر بحث کا موضوع ایک ہی ہے، مگر حضرت عائشہ پر فتنہ انگیزی کی تہمت اور حضرت علی کی خلافت پر رائے کے بارے میں دونوں روایات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلی روایت میں وضاحت ہے کہ فسادیوں کا مدینہ پر غلبہ ہو گیا تھا، جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ معاملات ان کے درمیان بہتر طریقے سے طے ہو گئے۔

پھر جس طریقے سے ام المومنین سے گفتگو کی گئی ہے، وہ ان کے مرتبہ و مقام کے پیش نظر موزوں نہیں۔ راوی کا لب و لہجہ گستاخانہ ہے جس سے یہ روایت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اشعار کا اسلوب بھی اس زمانے کے اسلوب سے لگا نہیں کھاتا جس میں یہ واقعہ رونما ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ کی ذات پر اتنی بڑی تہمت لگائی جاتی ہے تو وہ اس کی نفی نہیں کرتیں، بلکہ کہتی ہیں کہ میرا آخری قول پہلے سے بہتر ہے۔ گویا وہ اس تہمت کو قبول کر رہی ہیں جس کے ہوتے ہوئے کسی کا ایمان بھی سلامت نہیں رہتا۔ یہ بات سیدہ عائشہ کی فہم و فراست اور فقہی احکام میں ان کی مہارت کے منافی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ''البدایۃ والنہایۃ'' (۱۹۵/۷) میں صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ حضرت عائشہ نے ان تہمتوں سے انکار کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جب یہ کہا: ''تم نے اسے ایسے چھوڑا جیسے میل کچیل سے صاف کپڑا، پھر تم نے اسے قتل کر دیا تو مسروق نے کہا: یہ آپ کا کیا دھرا ہے۔ آپ نے لوگوں کو لکھ کر خروج کی دعوت دی تو آپ نے کہا: اس ذات کی قسم مومن جس پر ایمان لاتے ہیں اور کافر جس کا انکار کرتے ہیں، میں نے آج تک ان کو کچھ بھی نہیں لکھا۔ بلوائی جھوٹی تحریریں گھڑ کر ان کو صحابہ اور امہات المومنین کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ یہ تحریریں فسطاط کے مقام پر جامع عمرو بن العاص میں برملا پڑھی جاتی تھیں جس میں حضرت عثمان کے بارے میں شکوے ہوتے تھے۔ یہ ان کا بہت بڑا ہتھیار تھا، جس کو وہ اپنی سازش کو کامیاب بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

چنانچہ یہ روایت سند اور متن، دونوں اعتبار سے ساقط ہے۔

طبری کی دوسری روایت

طبری نے محمد بن عمر الواقدی کے واسطے سے روایت کی کہ ابن عباس نے کہا کہ مجھے حضرت عثمان نے کہا کہ حج کا امیر بن کر جاؤ اور ایک تحریر حاجیوں کے لیے دی کہ ان سے کہو کہ میرا حق ان سے لیں جنھوں نے میرا محاصرہ کیا ہوا ہے۔

چنانچہ ابن عباس گئے اور صُلصُل کے مقام پر ان کی ملاقات حضرت عائشہ سے ہوئی، وہ کہنے لگیں: اے ابن عباس، میں تجھے اللہ کا واسطہ دیتی ہوں (بے شک، تجھے چرب زبان عطا ہوئی ہے) کہ اس آدمی کا ساتھ چھوڑ دو اور اس کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں شک ڈالو، بے شک ان کی فراست نکھر چکی ہے اور واضح ہو چکی ہے اور ان کے لیے مینار نصب ہو چکا ہے۔ لوگ مختلف شہروں سے ایسے کام کے لیے جمع ہوئے ہیں جس کا ہونا قرار پا چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ بیت المال کے نگران ہیں اور خزانوں کی چابیاں ان کے پاس ہیں، اگر وہ والی بن جائیں تو وہ اپنے چچا زاد ابوبکر کے طریقے پر چلیں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اماں جان، اگر اس آدمی (عثمان) پر کوئی حادثہ گزرا تو لوگ ڈر کر ہمارے ساتھی (حضرت علی) کی پناہ لیں گے۔ حضرت عائشہ نے کہا: تجھ سے دوری ہو، میں نہ تو تم پر غلبہ پانا چاہتی ہوں، نہ تم سے جھگڑنا چاہتی ہوں (تاریخ الامم والملوک ۴/۴۰۷)۔

سند کا تجزیہ

واقدی اس روایت میں منفرد ہے اور اس کی منفرد روایت قابل حجت نہیں۔ دوسرے راوی ابن ابی سرہ پر تہمت ہے کہ وہ حدیثیں وضع کرتا تھا۔

متن کا تجزیہ

ابن عباس خلیفۂ وقت کی طرف سے حج کے امیر تھے۔ کیا تصور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہ جیسی دانا خاتون ان سے اس قسم کا مطالبہ کر سکتی تھیں۔ ایک طرف تو وہ ابن عباس سے مطالبہ کرتی ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں شک ڈالو اور دوسری طرف یقین سے کہہ رہی ہیں کہ لوگوں پر واضح ہو چکا ہے کہ اس معاملہ کا انجام کیا ہوگا۔ مینار نصب ہو چکا ہے۔ جب سب کچھ طے ہو گیا تھا تو پھر شک ڈالنا بے سود تھا؟

حضرت عائشہ طلحہ کو خلیفہ بنانا چاہتی تھیں، یہ بات قطعی غلط ہے۔ صحیح روایات اس بات کی نفی کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ اور طلحہ حضرت علی کے سوا کسی اور کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ ابن سیرین سے روایت ہے کہ حضرت علی نے طلحہ کو خلافت پیش کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ تاریخ کی کتابوں میں حضرت عائشہ کے بارے میں جو روایات سیف بن

عمر سے مروی ہیں، ان میں اس قسم کا کوئی تعارض نہیں اور نہ ان روایات میں تعارض ہے جو صحاح ستہ میں مروی ہیں۔ اس کے علاوہ جو الفاظ روایت میں حضرت عائشہ سے منسوب ہیں، وہ ان کے شایان شان نہیں۔

طبری کی ان روایات کے علاوہ دوسری غیر مستند روایات وہ ہیں جو تاریخ یعقوبی، تاریخ مسعودی اور بلاذری کی ''انساب الاشراف'' جیسی غیر معتبر کتاب میں بیان ہوئی ہیں یا جن کا تذکرہ الأغانی اور ''العقد الفرید'' جیسی اول کتابوں میں ملتا ہے۔

تاریخ یعقوبی کی روایت

تاریخ یعقوبی (۱۸۵/۲) میں حضرت عثمان اور حضرت عائشہ کے درمیان اختلاف کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت عائشہ کا وظیفہ جو حضرت عمر نے مقرر کیا تھا، کم کر دیا۔ ایک روز حضرت عثمان خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت عائشہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص نکال کر بلند آواز سے کہا: اے مسلمانو، یہ رہی رسول اللہ کی قمیص جو ابھی بوسیدہ نہیں ہوئی، جبکہ عثمان نے ان کی سنت کو بوسیدہ کر دیا ہے۔ اس پر حضرت عثمان نے کہا کہ اللہ مجھے ان عورتوں کے مکر سے بچا۔ بے شک، ان کا مکر بہت بڑا ہے۔

یعقوبی نے یہ روایت بغیر کسی سند کے بیان کی ہے۔ اس روایت کا مقابلہ طبری (۶۱۴/۳) کی روایت سے کریں تو بات صاف ہو جائے گی۔ ''تاریخ طبری'' میں ہے کہ حضرت عمر نے تمام امہات المومنین کے لیے سوائے ملک یمین (لونڈیوں) کے دس دس ہزار مقرر کیے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے کہا کہ اللہ کے رسول تقسیم میں ہمیں لونڈیوں پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔ ہمارے درمیان مساوات کرو۔ چنانچہ حضرت عمر نے ایسا ہی کیا اور حضرت عائشہ کے لیے رسول کی محبت کی خاطر دو ہزار بڑھا دیے، مگر آپ نے یہ زیادہ رقم قبول نہ کی۔ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عائشہ نے وظیفے میں کمی کے باعث حضرت عثمان پر سنت کی مخالفت کی تہمت لگائی ہو گی، پھر کون سی سنت؟ عہد رسالت میں تو اتنا مال بھی نہ تھا کہ حضورؐ اپنی بیویوں کے لیے وظیفہ مقرر کرتے اور اگر مال ہوتا تو پھر بھی آپ عدل کرتے۔ حضرت عثمان پر وظیفہ کم کرنے کی تہمت سخاوت کی اس صفت کے منافی ہے جس میں وہ مشہور تھے۔

امام بخاری نے اپنی تاریخ میں حسن بصری سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عثمان کا وہ زمانہ پایا ہے جب لوگ ان کی عیب جوئی کرتے تھے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے جب کسی دن حضرت عثمان نے مسلمانوں میں صدقات و خیرات، گھی اور شہد نہ بانٹے ہوں۔ ان سے کہا جاتا، اپنا رزق لے لو اور وہ بڑھ کر لیتے تھے۔ ایسے شخص سے توقع کی

جا سکتی ہے کہ انھوں نے ام المومنین کا وظیفہ کم کر دیا ہو گا۔

''انساب الاشراف'' کی دو روایات

بیت المال میں کچھ زیور تھا جو حضرت عثمان نے اپنی کسی بیوی کو پہنا دیا۔ حضرت عمار بن یاسر نے اختلاف کیا۔ حضرت عثمان نے ان کو مارا اور گالیاں دیں، اس پر حضرت عائشہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بال، ایک جوتا اور ایک قمیص نکالی اور کہا: تم نے کس قدر سرعت کے ساتھ اپنے نبیؐ کی سنت کو ترک کر دیا ہے۔ یہ رہا ان کا بال، ان کا جوتا اور ان کا کپڑا جو ابھی بوسیدہ نہیں ہوئے۔ اس پر حضرت عثمان کو سخت غصہ آیا۔ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ مسجد میں اضطراب سا پیدا ہو گیا اور لوگ زور زور سے بولنے لگے (۴۹/۵)۔ حضرت عثمان اور حضرت عمار بن یاسر کے درمیان اختلاف کا سبب مختلف روایات میں مختلف ہے۔ امام طبری، مسعودی اور بلاذری کی اس روایت کے سوا دور دور تک اس روایت میں حضرت عائشہ کا نام نہیں ملتا۔ طبری کی روایت کے سوا یہ سب روایات موضوع ہیں، کیونکہ جب حضرت عثمان کے خلاف مختلف مقامات سے خطوط آنے لگے تو آپ نے جن لوگوں کو تحقیق کے لیے بھیجا، ان میں حضرت عمار بن یاسر بھی شامل تھے اور مصر میں فسادیوں نے ان کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

بلاذری نے ''انساب الاشراف'' میں ایک اور روایت نقل کی ہے کہ حضرت عثمان کا حضرت عائشہ سے اختلاف اس بات پر تھا کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کے بیت المال سے ہٹا کر اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو مقرر کر دیا تھا (۳۶/۵)۔ یہ عجیب و غریب روایت ہے۔ جب حضرت عثمان کو خلافت ملی تو اسی ابن مسعود نے کہا تھا: ''جب حضرت عمر کی وفات ہوئی، ہم نے اپنے میں سے بہتر شخص کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور ہم نے کوئی کوتاہی نہیں کی''۔ ایسے شخص سے متعلق حضرت عثمان کا دویبۃ سوء (رینگنے والا حقیر اور برا جانور) کہنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن مسعود سے ان کا قرآن لے کر جلا دیا گیا تو انھوں نے برا منایا اور کہا کہ وہ زید بن ثابت سے پہلے مسلمان ہوئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اپنے اپنے مصحف پکڑ لو۔ حضرت عثمان نے ان کو دوسرے صحابہ کی پیروی کی دعوت دی تو انھوں نے فوراً کہا مانا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ان کو عہدے سے ہٹایا گیا تو انھوں نے کہا نہ مانا ہو گا۔

اس روایت میں بھی پہلی روایت کی طرح خواہ مخواہ حضرت عائشہ کا نام گھسیٹ دیا گیا ہے۔

''کتاب الاغانی'' کی روایت

''کتاب الاغانی'' (۱۸۰/۴) میں روایت ہے کہ جب اہل کوفہ نے حضرت عثمان سے ولید بن عقبہ کے بارے میں شکایت کی تو ولید نے ان کو ڈرایا دھمکایا تو انھوں نے سیدہ عائشہ کے گھر میں پناہ لی۔ صبح کے وقت حضرت عثمان نے ان کے حجرہ سے ان کی آواز سنی۔ وہ ان کے بارے میں درشت الفاظ استعمال کر رہی تھیں۔ تو حضرت عثمان نے کہا: کیا اہل عراق کے خارجیوں اور فاسقوں کو عائشہ کے گھر کے علاوہ اور کوئی گھر نہیں ملا؟ حضرت عائشہ نے ان کی بات سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جوتا اٹھا کے کہا: تم نے اس جوتے والے اللہ کے رسول کی سنت کو ترک کر دیا ہے۔ لوگوں کو پتا چلا تو وہ پے در پے مسجد کی طرف آنے لگے اور ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ ''کتاب الاغانی'' کے مصنف ابوالفرج اصفہانی پر شیعہ ہونے کی تہمت ہے۔

یہ چاروں روایات ایک ہی منظر پیش کرتی ہیں، جس میں حضرت عائشہ کبھی قمیص بلند کرتی ہیں، کبھی جوتا اور کبھی بال۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک ہاتھ کام کر رہا ہے جو ان کو اس فتنے میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت عائشہ جیسی عالم فاضل زیرک و دانا خاتون مسلمانوں کے خلیفے کی اس طرح توہین کریں اور ان کے درمیان تفرقہ ڈالنے کی کوشش کریں۔

خلاصۂ بحث

مستند اور صحیح روایات کے مقابلے میں ان ضعیف اور موضوع روایات کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کو اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے ایک نئی تاریخ کی تخلیق کر کے مسلمانوں کے دین میں خلفشار پیدا کر دیا ہے۔ اگر ان روایات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو صحابہ کی عدالت خطرے میں پڑ جاتی ہے جس کی گواہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

آخر میں ہم وہی کہتے ہیں جو امام نووی (صحیح مسلم، شرح النووی ۲۴۲/۵) نے کہا ہے کہ ''حضرت عثمان مظلوم قتل ہوئے ہیں، فاسقوں نے انھیں قتل کیا۔ کیوں قتل کیا؟ یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ان سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوا جو قتل کا متقاضی ہو۔ ان کے قتل میں کوئی صحابی شریک نہیں۔ ان کو تو صرف وحشی اور فسادی کمینے اور گھٹیا لوگوں نے قتل کیا جو جتھے بنا کر مصر سے آئے تھے۔ موجود صحابہ ان کا دفاع نہ کر سکے تو انھوں نے ان کا محاصرہ کر کے قتل کر دیا۔''

اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ کا موقف حضرت عثمان کی زندگی اور ان کے قتل کے دوران بڑا واضح اور صاف تھا۔

قتل عثمانؓ کے بعد کے حالات

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد مدینہ میں افراتفری کا عالم تھا۔ مدینہ پر بلوائیوں کا قبضہ تھا اور انھی کا حکم چلتا تھا۔ مسلمان کئی روز تک امام کے بغیر رہے۔ نماز کی امامت سرکشوں کا قائد عبدالرحمٰن غافقی کرتا تھا۔ ایسے حالات میں مسلمان نہ خلیفہ کا انتخاب کر سکتے تھے، نہ بیعت کا مطالبہ۔ بلوائی خلیفہ کی تلاش کر رہے تھے۔ عام مسلمان خلیفہ کے ناحق قتل پر غصے میں تھے اور وہ اس معاملہ میں بلوائیوں کی دخل اندازی کو بھی ظلم سمجھتے تھے۔ خلیفہ کا انتخاب اہل رائے کا حق تھا۔ روایات اس بارے میں متفق ہیں کہ حضرت علی، طلحہ اور زبیر تینوں نے خلیفہ بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کام کے لیے جو بھی ان کے پاس آیا، انھوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ انکار کے بعد بلوائیوں نے دو دن کی مہلت دی اور کہا کہ تیسرے دن ان تینوں کو قتل کر دیں گے (تاریخ الامم والملوک ۴/ ۴۳۴)۔ بلوائی خلیفہ کا انتخاب کر کے لوگوں کے غیظ و غضب سے بچنا چاہتے تھے۔ یہ حالات تھے کہ لوگوں نے حضرت علیؓ کے پاس آ کر ان کو خلیفہ بننے کی دعوت دی تاکہ مدینہ مزید فتنہ و فساد سے بچ جائے۔ لوگوں کے اصرار پر حضرت علیؓ راضی ہوئے۔ لوگوں نے ان سے کہا: ہم آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں، کیا آپ کو وہ نظر نہیں آ رہا جو ہم دیکھ رہے ہیں؟ کیا آپ فتنہ نہیں دیکھ رہے؟ کیا آپ اسلام کی بھلائی نہیں چاہتے؟ کیا آپ کو اللہ کا خوف نہیں؟ لوگ یہ باتیں مسلسل کہتے رہے، یہاں تک کہ آپ نے ان کی بات مان لی۔ جس طرح حضرت علیؓ کو خلافت پر مجبور کیا گیا، بعد میں اسی طرح حضرت طلحہ اور زبیر کو اشتر نخعی اور حُکیم بن جبلہ نے تلوار گردن پر رکھ کر بیعت کے لیے مجبور کیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بیعت کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ اس لیے کہ اوباش شرفا پر حکم چلا رہے تھے۔ طبری (۴/ ۴۳۴) کی صحیح روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حالات نارمل ہوئے تو حضرت علیؓ نے حضرت طلحہؓ سے کہا: ہاتھ آگے بڑھاؤ میں تمھاری بیعت کرتا ہوں۔ حضرت طلحہ نے کہا کہ آپ زیادہ حق دار ہیں، اپنا ہاتھ بڑھائیں۔ حضرت علی نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت طلحہ نے بیعت کی۔ باقی مسلمانوں کو بھی بیعت پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے ان الفاظ کے ساتھ بیعت کی کہ ہم اس لیے بیعت کر رہے ہیں کہ اللہ کی کتاب کو قریب و بعید اور ذلیل و عزیز پر نافذ کیا جائے گا۔ گویا وہ حضرت عثمان کے قاتلوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ ان پر اللہ کی حدود قائم کی جائیں گی۔

اقامت حدود کے بارے میں حضرت علی، طلحہ اور زبیر کے درمیان مکالمہ

حضرت علی، طلحہ، زبیر اور چند صحابہ کا اجتماع ہوا، تو دوسروں نے حضرت علی سے کہا کہ ہم نے حد نافذ کرنے کی شرط پر بیعت کی ہے۔ حضرت علی نے کہا: بھائیو، جو تم جانتے ہو، میں اس سے ناواقف نہیں، لیکن میں ان لوگوں سے کیسے نمٹوں جو ہم پر حکم چلا رہے ہیں اور ان کے ساتھ تمھارے غلاموں اور بدوؤں نے بھی اودھم مچایا ہوا ہے؟ کیا میں جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس پر قدرت رکھتا ہوں، انھوں نے کہا: بخدا، ہماری بھی وہی راے ہے جو تمھاری راے ہے۔

لوگ فوراً حد نافذ کرنا چاہتے تھے۔ حضرت علی نے نکل کر لوگوں سے کہا: بدوؤں کو اپنے یہاں سے نکال دو اور بدوؤں سے کہا: اپنی اپنی چراگاہوں کی طرف لوٹ جاؤ۔ بلوائیوں نے سمجھا کہ ان کے اکٹھ میں تفرقہ ڈالا جا رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بدوؤں کو بھڑکایا علی کے خلاف بلوہ ہو گیا اور وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی اندر داخل ہوئے تو حضرت علی نے کہا کہ قاتل کو قتل کر کے بدلہ لے لو انھوں نے کہا کہ قاتل خلط ملط ہو گیا ہے۔ حضرت علی نے کہا کہ آج کے بعد وہ اور زیادہ خلط ملط ہو جائے گا۔

حضرت علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور دیگر صحابہ اس بات پر متفق تھے کہ جن لوگوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالا ہے اور خلیفہ کو ناحق قتل کیا ہے، ان پر حد نافذ ہونی چاہیے تاکہ دین اسلام کو کوئی ضرر نہ پہنچے، لیکن کسی میں فتنہ پردازوں سے لڑنے کی طاقت نہیں تھی، کیونکہ وہ غلاموں اور بلوائیوں کے ساتھ مل کر مدینہ پر غالب آ چکے تھے۔

کیا ہی اچھا ہوتا اگر حضرت علیؓ حد کو قائم کرنے کا واضح پروگرام صحابہ کے سامنے پیش کر دیتے تو ان کو پتا چل جاتا کہ وہ اس بارے میں سنجیدگی سے کوشش کر رہے ہیں، مگر حضرت علیؓ ان سے یہی کہتے رہے: دیکھو اور انتظار کرو اور معاملات لشٹم پشٹم اسی طرح چلنے دیتے۔ اس دوران حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ نے ایسا خیال پیش کیا کہ اگر اس پر عمل درآمد کیا جاتا تو ممکن تھا کہ حضرت علی کی پوزیشن بلوائیوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہو جاتی۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم بصرہ اور کوفہ جاتے ہیں اور اچانک آپ کے پاس اپنے سرداروں کے ساتھ حاضر ہو جائیں گے۔ جواب میں حضرت علیؓ نے کہا کہ ہیں اس بارے میں سوچوں گا (تاریخ الامم والملوک ۴/۴۳۸)۔

صحابہ دیکھ رہے تھے کہ حضرت عثمان کو قتل ہوئے چند ماہ گزر گئے ہیں، مگر حضرت علی حد نافذ نہیں کر پائے۔ ان کو گمان گزرا کہ حضرت علیؓ کو ان کی راے کی کوئی پروا نہیں۔ ایک طرف تو حضرت علی، حضرت عثمان کے مقرر کردہ عاملوں کو جلدی جلدی ہٹا رہے تھے تو دوسری طرف بلوائیوں کے بارے میں تساہل کر رہے تھے۔ انھوں نے حضرت علی کو گھیرے میں لیا ہوا تھا اور ان کے لشکر میں بھی گھس گئے تھے۔ فتنہ پرداز حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ

لینے کے مطالبین کے درمیان تعلقات کو اور بگاڑ رہے تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اللہ کی حدود کے تعطل پر صبر نہ کر سکے۔ چنانچہ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ نے حضرت علیؓ سے یہ کہتے ہوئے مدینہ چھوڑنے کی اجازت طلب کی کہ یا تو ہم غلبہ پا لیں گے یا آپ ہمیں چھوڑ دیں۔ اس پر حضرت علی نے کہا: جب تک میں معاملات سنبھال سکا سنبھالے رہوں گا اور اگر میرے پاس کوئی چارہ نہ رہا تو آخری دوا لوہے سے داغنا ہے۔

حضرت علی سمجھتے تھے کہ ان دونوں کا مدینہ سے خروج ممکن ہے کسی حل کا باعث ہو، اس لیے آپ نے انھیں نہ روکا، کیونکہ ان کی خواہش بھی یہ تھی کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے۔

حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے حضرت عائشہؓ کا خروج

حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ مکہ پہنچنے کے بعد حضرت عائشہؓ سے ملے۔ انھوں نے پوچھا: تمھارے پیچھے کیا حالات ہیں؟ انھوں نے کہا: ہم بلوائیوں اور بدوؤں کے ڈر سے بوریا بستر باندھ کر مدینہ چھوڑ آئے ہیں۔ وہاں لوگ پریشان ہیں، ان کو حق یا باطل کا کچھ پتا نہیں چلتا اور نہ وہ اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: باہم مشورہ کرو اور ان بلوائیوں کے خلاف کھڑے ہو جاؤ۔

سب لوگوں نے سوچ بچار کے بعد بصرہ کی طرف خروج کا فیصلہ کیا۔ حضرت عائشہ نے کھڑے ہو کر خطاب کیا: ''اے لوگو، بہت ہی بڑا حادثہ اور بہت ہی ناپسندیدہ کام ہو گیا ہے۔ بصرہ میں اپنے بھائیوں کی طرف جا کر اس کا مداوا کرو۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ عثمانؓ اور مسلمانوں کا انتقام لے لے۔'' حضرت عائشہ نے یہی بات عبداللہ بن حضری سے بہت پہلے کہی تھی۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ تو حضرت عثمانؓ کے قتل سے چار ماہ بعد مکہ پہنچے تھے۔ یہ رائے حضرت عائشہ کی اپنی مستقل رائے تھی۔ اس روایت سے یعقوبی، ابن ابی حدید اور صاحب ''الامامۃ والسیاسۃ'' کی رائے کی تردید ہو جاتی ہے، جس کے مطابق حضرت طلحہ نے حضرت عائشہ کو اس رائے پر مجبور کیا تھا۔ نہ وہ کسی کی رائے سے مغلوب ہوتی تھیں اور نہ اپنی رائے کسی پر مسلط کرتی تھیں۔ طبری کی سیف بن عمر سے روایات اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ اور دوسرے صحابہ اصلاح کی غرض سے نکلے تھے۔ اہل بصرہ کی بہت بڑی تعداد بھی اس رائے کی تائید کرتی تھی (تاریخ الامم والملوک ۴/ ۴۰۴، ۴/۵/ ۴)۔ حضرت طلحہ اور زبیر کے الفاظ میں بصرہ کے وہ لوگ چیدہ چیدہ بہترین لوگ تھے اور حضرت عائشہ ان کو صالح کے لقب سے یاد کرتی تھیں۔ یہ خیال کہ حضرت عائشہ کا ساتھ احمقوں،

فسادیوں اور اوباش لوگوں نے دیا، قطعی غلط ہے۔ حضرت علی نے خود حضرت عائشہ کا ساتھ دینے والے کعب بن سوء کو بہت بڑا عالم اور عبدالرحمٰن بن عتاب کو یعسوب القوم (قوم کا سردار) کہا۔ وہ جب بھی کسی نیک کی لاش کے پاس سے گزرتے تو کہتے: ''نہیں نہیں جو یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے مقابلے میں فسادی نکلے، وہ غلط کہتا ہے۔ دیکھو، اس عابد اور مجتہد کی طرف (سیف بن عمر کی کتاب ''الجمل وسیر علی و عائشہ'' (۳۵۷-۳۵۸))۔ یہ خروج فتنہ و فساد کی غرض سے نہیں تھا، جس میں حضرت عائشہ گمراہ لوگوں پر حکم چلا رہی تھیں۔ یہ خروج سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا جس میں بہت سے صحابۂ کرام شریک تھے۔

امہات المومنین اور حضرت عثمان کے انتقام کا مطالبہ

اس سال امہات المومنین فتنہ سے فرار اختیار کر کے حج کے لیے نکلی تھیں، جب مکہ میں حضرت عثمان کے قتل کی خبر پہنچی تو انھوں نے مکے میں قیام کر لیا تھا۔ وہ مکے سے نکل کر واپس آ رہی تھیں۔ سب لوگ مل کر انتظار کر رہے تھے کہ فتنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ جب حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی تو چند صحابہ فسادیوں سے ڈر کر مکہ آ گئے۔ وہاں بہت سے صحابہ، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عثمان کے یمن میں عامل، یعلیٰ بن امیہ، طلحہ، زبیر، سعید بن عاص، ولید بن عقبہ اور دوسرے اموی سردار اور امہات المومنین رضی اللہ عنہم مکہ میں اکٹھے ہو گئے۔

باقی امہات المومنین مدینہ جانے کے لیے حضرت عائشہ سے متفق تھیں خروج کے بارے میں ان کا کوئی اختلاف نہ تھا، لیکن جب حضرت عائشہ کا دوسرے صحابہ کے ساتھ بصرہ جانے پر اتفاق ہو گیا تو وہ کہنے لگیں: ہم صرف مدینہ جائیں گے۔ حضرت حفصہؓ تو بصرہ جانے کے لیے بھی تیار تھیں، لیکن ان کے بھائی عبداللہ بن عمر نے قسم دے کر ان کو روکا، وہ عدم خروج پر مطمئن نہیں تھیں اور نہ ہی ان کے بھائی نے کسی شرعی سبب کی وجہ سے ان کو روکا تھا، لیکن ان کا تعلق صحابہ کی اس جماعت سے تھا جو اس مسئلہ میں شبہ کا شکار تھے اور طرفین میں سے کسی کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ کہتے تھے: میں تو مدینہ کا رہنے والا ہوں۔ اگر سب اہل مدینہ اٹھ کھڑے ہوں گے، میں بھی اٹھ کھڑا ہوں گا۔ اگر وہ بیٹھ جائیں گے تو میں بھی بیٹھ جاؤں گا (تاریخ الامم والملوک ۴/۴۴۶)۔ اسی وجہ سے انھوں نے اہل شام کے خلاف جنگ میں حضرت علی کا ساتھ نہ دیا۔ وہ گوشہ نشین رہے، اسی لیے انھوں نے اپنی بہن کو گوشہ نشینی کا مشورہ دیا۔

حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ کو پیغام بھیجا کہ میرا بھائی خروج میں حائل ہو گیا ہے اور اپنی معذرت پیش کی۔

حضرت عائشہ کی عمر اس وقت ۴۳ برس تھی اور وہ امہات المومنین میں سب سے کم عمر تھیں۔ مسلمانوں کے

درمیان اصلاح کے لیے خروج فرض کفایہ ہے، یعنی اس فرض کو وہی ادا کرے گا جس میں اہلیت ہو۔ حضرت عائشہ، مقام و مرتبہ، عمر، علم اور قدرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہل تھیں۔ وہ ایک سیاسی شخصیت کی مالک تھیں اور عام معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتی تھیں۔ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے گھر پرورش پائی تھی، جو عرب کی جنگوں اور انساب کے عالم تھے۔ انھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں زندگی گزاری تھی، جو اسلامی ریاست کی سیاست کا سرچشمہ تھا۔ پھر مسلمانوں کے پہلے خلیفہ کی بیٹی تھیں۔ وہ دین کے بارے میں خواتین کے مرتبہ و مقام اور ان کی ذمہ داریوں کو کما حقہ سمجھتی تھیں۔ امام زہری کا قول ہے: اگر سب لوگوں کا علم اور امہات المومنین کا علم ایک ساتھ جمع ہو جائے تو بھی عائشہ کا علم ان کے علم سے وسیع تر ہے۔ تابعی عطاء کا قول ہے: عائشہؓ سب لوگوں سے بڑھ کر فقیہ تھیں اور ان کی رائے سب لوگوں سے بہتر تھی۔ حضرت عروہ بن زبیر کا قول ہے: میں حضرت عائشہ کے ساتھ رہا ہوں، میں نے کسی آدمی، کسی آیت کے نزول کے بارے میں، فرض یا سنت کے بارے میں، کسی شعر کے بارے میں، ایام عرب اور انساب عرب کے بارے میں، قضا اور طب کے بارے میں ان سے بڑھ کر عالم نہیں دیکھا۔ احنف بن قیس بنو تمیم کا سردار تھا اور اس کا شمار فصحاء عرب میں ہوتا تھا، وہ کہتا ہے کہ میں نے ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کے خطبے سنے ہیں، میں نے کسی کے منہ سے عائشہ سے بہتر درست اور خوب صورت الفاظ نہیں سنے۔

باقی امہات المومنین میں اس معیار کی اہلیت نہیں تھی کہ لوگ ان سے تعاون پر آمادہ ہوتے۔ باقی امہات المومنین مدینہ کی طرف خروج پر رضامند تھیں۔ جب حضرت عائشہؓ نے بصرہ کی طرف خروج کیا تو انھوں نے انھیں خوشی خوشی رخصت کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی، نہ وہ روئیں اور نہ اصلاح کے لیے خروج سے انھیں جنگ و جدل اور خون ریزی کا شبہ ہوا۔

[باقی]